جامعہ رسالہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ادبی و علمی ترجمان

رسالہ جامعہ

مدیر

شہپر رسول

نائب مدیر

تجمل حسین خاں

مجلسِ مشاورت

پروفیسر نجمہ اختر (صدر)

سید شاہد مہدی	پروفیسر عبدالرحیم قدوائی
پروفیسر عتیق اللہ	پروفیسر شہپر رسول
پروفیسر انور پاشا	پروفیسر شہزاد انجم

پروفیسر اقتدار محمد خاں (ڈائرکٹر)

The Monthly Jamia ISSN 2278-2095

جلد نمبر: ۱۱۹، شمارہ: ۷، ۸، ۹/ جولائی - ستمبر ۲۰۲۲ء

- اس شمارے کی قیمت -/100 روپے (بیرونِ ممالک) 12 امریکی ڈالر
- سالانہ -/380 روپے (بیرونِ ممالک) 40 امریکی ڈالر
- حیاتی رکنیت -/5000 روپے (بیرونِ ممالک) 400 امریکی ڈالر

پرنٹنگ اسسٹنٹ: راشد احمد **ٹائٹل:** اریج گرافکس

مقالہ نگاروں کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

پتہ

رسالہ جامعہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی - ۲۵

Website: www.jmi.ac.in/zhiis E-mail:zhis@jmi.ac.in

طابع و ناشر: **پروفیسر اقتدار محمد خاں** اعزازی ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی - ۲۵

مطبوعہ : لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

ترتیب

- اداریہ — شہپر رسول — ۵
- سرگزشتِ الفاظ — مشفق خواجہ — ۹
- تہذیبِ نسواں: ایک محاکمہ — چودھری محمد نعیم — ۴۷

● 'شہاب نامہ' کی حقیقت	مرزا حامد بیگ	۸۵
● تحریکِ نسواں اور اردو ادب	علی احمد فاطمی	۱۰۳
● داستان تاریخِ اردو پورب کے مشاہیرِ ادب	اقبال سہیل	۱۲۱
● عبدالرحیم خانخاناں کا کتب خانہ	علاء الدین خاں	۱۴۳
● یادِ ماضی کے نقش حیدرآباد دکن کی انجمن آرائی	اختر حسین رائے پوری	۱۵۳
● عمیق حنفی جدید حسیت کا شاعر	تجمل حسین خاں	۱۸۵

اداریہ

ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی بحثیں آج خواہ ماضی کی طرح نہ ہوتی ہوں لیکن شعری ترسیل، پیغام رسانی، شفافیت اور اظہاری پُراسراریت سے پیدا ہونے والے شعری حسن اور معنوی تَہْدَاری کے مسائل ومعاملات آج بھی وہی ہیں۔ آج بھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاعری میں ابہام کا ہونا ایک بدعت ہے۔ گویا وہ شعر کو عام گفتگو یا کاروباری اظہار کے پیمانوں پر تولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض شعری نشستوں اور مشاعروں میں اس صورتِ حال سے سابقہ پڑتا ہے کہ بہت سے شعرا کے

اشعار سامعین تك اپنے مفهوم كی ترسیل تو كرادیتے هیں لیكن اُن كو جمالیاتی حظ اور وه تخلیقی سحر بهم نهیں پهنچاپاتے جو دیر تك اذهان كے ساتھ سفر كرتا هے۔

همیں شعری زبان اور عام زبان میں فرق كرنا چاهیے اور یه سمجهنا چاهیے كه لفظوں كی فضول خرچی شاعری كے لیے سمِ قاتل هے۔ شعری تخلیقی اظهار كی جان تو كفایتِ لفظی میں هے۔ لفظوں كے لفظوں سے بندهے ٹنكے ضابطوں كے تحت جكڑے هونے كے بجائے شعری متن جب خیال اور اظهار كی پیچ در پیچ موجوں كی صورت میں قاری تك پهنچتا هے تو اُس كا ذهن موجوں كے زیروبم سے پیدا هونے والے خلا، كهانچوں اور Gapsكو اپنی قوتِ احساس وتخیل سے پُر كرنا شروع كردیتا هے اور منزلِ مراد پر پهنچ كر مسرت خیز بصیرت سے هم كنار هوتا هے۔

شعر كا معامله بهت مختلف هے اُس كی ترسیل اور معنوی سفر میں بهی زبان اپنا كردار ادا كرتی هے لیكن شعری متن مفهوم كے بجائے مفاهیم اور معنی كے بجائے معانی پر اصرار كرتا هے ، یعنی اُس كو حتمی اور متعین حدود میں قید نهیں كیا جاسكتا بلكه وه ابهام، پیچیدگی، پُراسراریت اور معانی كی فراوانی سے لبریز هوتا هے۔ جس كی تفهیم وتحصیل میں قاری خود تخلیقِ مكرر كے

تجربے اور جمالیاتی حظ سے گزر کر ذھنی چراغاں سے دوچار ھوتا ھے۔ یہ معاملہ البتہ الگ ھے کہ اگر ابہام ترسیل کے عمل میں مانع ھوتا ھے تو یقیناً قابلِ مذمت ھے۔ شاعر کے مافی الضمیر اور شعر کو سحر بنانے والی کیفیت کا قاری تک نہ پھنچ پانا شعر اور شاعر دونوں کی بڑی ناکامی ھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ھے کہ صاف ستھری اور اکھری شاعری بھی شاعری کے منصب تک کہاں پھنچ پاتی ھے۔

شہپر رسول

سرگزشتِ الفاظ

مشفق خواجہ

'سرگزشتِ الفاظ' کا شمار اردو کی مشہور اور بہت زیادہ پڑھی جانے والی کتابوں میں ہوتا ہے۔ یہ اپنے موضوع پر اردو کی پہلی اور آخری کتاب ہے اور کئی یونیورسٹیوں میں اردو کی اعلیٰ جماعتوں کے نصاب میں شامل ہے۔ اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کی نظر سے یہ کتاب نہ گزری ہو۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس قدر یہ کتاب مشہور ہے، اس کا مصنف اُسی قدر گمنام ہے۔ آج **احمد دین** کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ ان کے مفصل حالاتِ زندگی تو کیا مختصر حالات بھی عام طور پر معلوم نہیں ہیں۔ **اردو ادب** کی تاریخوں میں کہیں ان کا نام نظر نہیں آتا۔ بعض مضامین اور ایک دو کتابوں میں اُن کا ذکر **اقبال** کے ایک دوست کی حیثیت سے ضرور آیا ہے، لیکن ان تحریروں سے **احمد دین** کے حالات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ **محمد الدین فوق** نے 'تاریخِ اقوامِ کشمیر'، میں اُن کے بارے میں چند سطریں لکھی ہیں، اس لیے نہیں کہ وہ ایک ادیب تھے، بلکہ

اس لیے کہ وہ **'کشمیری'** تھے۔ 'نقوش' کے لاہور نمبر میں مولوی **محمد اسماعیل پانی پتی** نے **فوق** کے بیان کو دُہرا دیا ہے، اپنی طرف سے ایک لفظ کا اضافہ نہیں کیا۔ ایسی صورت میں **احمد دین** کی داستانِ حیات کو تفصیل سے بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ بکھرے ہوئے اشارات اور **احمد دین** کے بعض جاننے والوں کے بیانات کے سہارے ایک سوانحی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ خاکہ بھی بڑی حد تک ادھورا ہے، جسے مکمل کرنے کے لیے مزید تحقیق اور چھان بین کی ضرورت ہے۔

خاندان

احمد دین کشمیری الاصل تھے۔ ان کا تعلق کشمیری قوم **'لون'** سے تھا۔ اس قوم سے متعلق **محمد الدین فوق** نے 'تاریخِ اقوامِ کشمیر' میں تفصیل سے بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ **'لون'** ہندوؤں کا ایک قدیم جنگ جُو طبقہ ہے جو ملکی نظم و نسق میں ایک طویل عرصے تک دخیل رہا ہے۔ اس قوم کے مشرّف بہ اسلام ہونے کے بارے میں **فوق** لکھتے ہیں:

> لون طبقہ کس زمانے میں مشرف به اسلام هوا، اس کے متعلق قیاساً هی کها جاسکتا هے که کچھ لوگ حضرت امیر کبیر سید علی همدانی کے کشمیر آنے سے پیش تر اور بهت زیاده اُن کے قیامِ کشمیر کے دوران میں دیگر اقوام کے ساتھ مسلمان هوگئے هوں۔[1]

اس قوم کے بہت سے خاندان کشمیر سے نقلِ مکانی کر کے پنجاب کے مختلف حصوں میں آباد ہو گئے تھے۔ **احمد دین** کا خاندان بھی (جو **خواجہ** کہلاتا تھا) اُنہی میں سے تھا۔ **احمد دین** کے دادا، جن کا نام **عبدالرحمٰن لون** تھا، کشمیر سے پنجاب آئے اور لاہور کو انھوں نے اپنا مسکن بنایا۔ **عبدالرحمٰن لون** کے بارے میں کسی قسم کی معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ ان کے پیشے اور لاہور آنے کے زمانے کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ **احمد دین** کے والد کا نام **الٰہ دین** تھا۔ انھوں نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ سرکاری ملازم تھے اور اس سلسلے میں زیادہ تر لاہور اور کچھ عرصے کے

لیے گجرانوالہ میں مقیم رہے۔ لاہور میں وہ جیل میں بطور ڈاکٹر متعین تھے۔ **الٰہ دین** کی دو بیٹیاں تھیں اور دو بیٹے۔ **احمد دین** بڑے بیٹے تھے اور چھوٹے کا نام **خواجہ تاج الدین** تھا۔ **تاج الدین** خفیہ پولیس میں سنٹرل انٹیلی جنس آفیسر تھے۔ انگریزی حکومت نے انھیں 'خان بہادر' کا خطاب دیا تھا۔ ان کا انتقال تقسیمِ ہند کے کچھ عرصے بعد ہوا۔

پیدایش اور تعلیم

احمد دین ۱۸۶۶ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم کا آغاز ایک مسجد کے مکتب سے ہوا۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے گجرانوالہ میں حاصل کی، جہاں ان کے والد ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ کچھ عرصے بعد ڈاکٹر **الٰہ دین** کا تبادلہ لاہور ہوگیا تو **احمد دین** کو سنٹرل ماڈل اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ یہاں سے انھوں نے **میٹرک** کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ گورنمنٹ کالج (لاہور) میں داخل ہوگئے۔ **بی اے** تک تعلیم انھوں نے اسی کالج سے حاصل کی۔ وہ **انگریزی** میں **ایم اے** کرنا چاہتے تھے اور اس غرض سے انھوں نے مذکورہ کالج میں داخلہ بھی لے لیا تھا، لیکن جلد ہی انھوں نے یہ ارادہ ترک کردیا اور **قانون** کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوگئے اور اس کی تکمیل کی۔ اگر **احمد دین** نے سولہ برس کی عمر میں **میٹرک** کا امتحان پاس کیا ہو، بیس برس کی عمر میں **بی اے** کا اور پھر دو برس مزید تعلیم میں صَرف کیے ہوں تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ ۱۸۸۸ء میں تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔

احمد دین ابتدا ہی سے نہایت ذہین تھے۔ بقول **سر عبدالقادر**: "ان کا شمار اپنے زمانے کے نامور طلبہ میں ہوتا تھا۔"[۲] **بی اے** کے امتحان میں انھوں نے درجۂ اول میں بہت اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کی جس کے صلے میں انھیں یونیورسٹی کی طرف سے طلائی تمغہ ملا۔ گورنمنٹ کالج میں انھیں **اردو** کے عظیم انشا پرداز **مولانا محمد حسین آزاد** کی شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی، **آزاد** سے **احمد دین** بے حد متاثر ہوئے اور اسی تعلق نے ان میں ادب کا صحیح ذوق پیدا کیا۔ **آزاد** نے اپنے اِس شاگرد کی ادبی شخصیت کو بنانے میں جو حصہ لیا ہے، اس کا اظہار **احمد دین** کی تصانیف سے بخوبی ہوتا ہے۔ انھوں نے **آزاد** کے اُسلوب کو اپنانے کی جو کوشش کی ہے وہ بھی اِسی ذاتی تعلق کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

صحافت، ملازمت اور وکالت

سر عبدالقادر نے لکھا ہے کہ **احمد دین** تعلیم سے فراغت کے بعد سے: "لاھور کے نامی وکلا میں سے ھیں۔"[۳] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وکالت کے سوا کوئی اور کام نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ **احمد دین** نے پہلے صحافت کا پیشہ اپنایا اور پھر وکالت کو ذریعۂ معاش بنایا۔

سر عبدالقادر کی مذکورہ تحریر اُن کے ایک ادارتی نوٹ سے ماخوذ ہے۔ یہ نوٹ مکمل طور پر آیندہ سطور میں کہیں پیش کیا جائے گا۔ اس میں **احمد دین** کی صحافتی خدمات کا ذکر نہیں ہے۔ اس کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۰۱ء تک (جب مذکورہ نوٹ لکھا گیا تھا) **احمد دین** صحافت ختم کر چکے تھے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے لاھور کے مشہور اخبار 'پیسہ اخبار' میں کام کیا۔ ان کی علمی و ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز اسی اخبار سے تعلق کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ اس اخبار سے تعلق کی تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں، تاہم **پھول چند** نے پنجاب کی صحافت سے متعلق جو مضمون لکھا ہے اُس سے اِس معاملے پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ **مولوی محبوب عالم** کا ذکر کرتے ہوئے **پھول چند** لکھتے ہیں:

> *M. Mehbub Alam has generally been called* ایڈٹر گر ایڈیٹر *i.e. editor-making editor. This is a happy appellation, since the Paisa Akhabar was a veritable training ground for many of the future editors of the province. The names of Lala Dina Nath later the editor of the Hindustan, Hakim Ghulam Nabi later the editor of Al-Hukma, Munshi Ahmed Din later the editor of the Gham Khawar-i-Alam Mohammad-ud- Din*

Fouq later the editor of the Kashmiri, Maulvi Shuja-ud- Dauwala later the editor of the Millat, stand out prominent among those who had served their apprenticeship in this training school.
(Journal of the Punjab University and Historical Society. Vol. II part1, April 1933 p. 38)

احمد دین پیسہ اخبار ' سے کب منسلک ہوئے اور کب تک انھوں نے اس اخبار میں کام کیا، اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ گمانِ غالب ہے کہ وہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد صحافت کے میدان میں آئے اور بیسویں صدی کے آغاز سے قبل ہی پیسہ اخبار ' سے ان کا تعلق ختم ہو گیا۔ ویسے بحیثیت ایک مصنف کے اس اخبار کے ادارے سے ان کا تعلق بعد میں بھی قائم رہا۔ پیسہ اخبار ' اور اس کے مملوکہ خادم التعلیم اسٹیم پریس (لاھور)[۴] کی طرف سے **احمد دین** کی کتابیں شائع کی جاتی تھیں۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، ان دونوں اداروں سے ۱۹۱۰ء تک **احمد دین** کی کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ واضح رہے کہ یہ تعلق ملازمت کا نہیں تھا، مصنف اور ناشر کا تھا۔

پھول چند نے یہ بھی بتایا ہے کہ **احمد دین** اخبار غم خوارِ عالم ' کے ایڈیٹر تھے۔ **احمد دین** نے خود بھی اپنی ایک کتاب جلال الدین محمد اکبر ' کے دیباچے کے آخر میں اپنے نام کے ساتھ 'سابق ایڈیٹر غم خوارِ عالم ' لکھا ہے۔ مذکورہ کتاب کا سالِ طباعت معلوم نہیں ہے، لیکن یہ یقینی ہے کہ اس کتاب کے ناشر (**منشی رام اگروال**) نے **احمد دین** کی جو کتابیں شائع کی ہیں وہ بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اخبار غم خوارِ عالم ' انیسویں صدی کے آخری چند برسوں میں شائع ہوتا رہا ہوگا۔ اس اخبار کا ہماری صحافت کی تاریخوں میں ذکر نہیں ملتا۔ ایک آدھ ذکر ہے جو **پھول چند** ہی کی صدائے بازگشت ہے اور وہ بھی بلا حوالہ۔

گزشتہ صدی کے آخری دو تین برسوں میں انھوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور کچھ عرصے میں ان کا شمار ممتاز اور نامور وکیلوں میں ہونے لگا۔

۱۹۰۱ء کے بعد **احمد دین** نے ایک مرتبہ پھر ملازمت کی۔ ان کی دو کتابیں حیاتِ ٹوڈرمل

اور 'جلال الدین محمد اکبر' پر ان کے نام کے ساتھ ملازم دفتر اردو اخبار لکھا ہے۔ یہ اخبار کب جاری ہوا، اور کب تک جاری رہا، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ **مولوی محبوب عالم** کی مرتبہ 'فہرست اخباراتِ ہند' (خادم التعلیم اسٹیم پریس (لاہور) ۱۹۰۴ء۔ دیباچے کے آخر میں تاریخ نومبر ۱۹۰۳ء میں اس اخبار کا نام شامل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴-۱۹۰۳ء میں یہ اخبار شائع ہو رہا تھا۔ **منشی رام اگروال** تاجر کتب (لاہور) جو تعلیمی کتب خانہ پنجاب کے مہتمم تھے، 'اردو اخبار' کے ناشر تھے۔ **عبداللہ قریشی** صاحب کا بیان ہے کہ **منشی محمد الدین فوق** اس اخبار کے ایڈیٹر تھے۔[۵] **فوق** کی جو آپ بیتی 'نقوش' (لاہور) کے آپ بیتی نمبر میں شائع ہوئی ہے، اس میں متعدد ایسے اخباراوں کا ذکر ہے جن سے **فوق** کا تعلق رہا ہے۔ لیکن ان اخباروں میں 'اردو اخبار' کا نام نہیں ہے۔ 'حیاتِ ٹوڈرمل' کے سرورق کے اندرونی حصے میں اس اخبار کا مندرجہ ذیل اشتہار شائع ہوا تھا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کس قسم کا اخبار تھا:

> اس کتب خانے سے 'اردو اخبار' هفته وار شائع هوتا هے جس میں دلچسپ اور مفید مضامین تازه به تازه خبروں کے علاوه شعر وسخن، دل خوش کن لطائف وظرائف اور عقل کے کرشمے یعنی حل طلب معمّے (بعض انعامی معمّے) بھی درج هوتے هیں۔ قیمت سالانه محصول ڈاك صرف ایك روپیه آٹھ آنے هے۔ نقد قیمت ادا کرنے سے ایك روپے کے انعامی ناول اصلی قیمت پر (صرف انعامی ناولوں مندرجهٔ حاشیهٔ اخبار میں سے) مفت ملتے هیں۔ اخیر سال کو خریداروں میں کئی قسم کے نقدی انعام بھی تقسیم هوتے هیں۔ یه اخبار بعض صورتوں میں مفت بھی مل سکتا هے۔ مفصل حالات وشرائط کے لیے نمونه کا پرچه مفت طلب

فرماکر ملاحظہ فرمائیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ **احمد دین** نے 'اردو اخبار' کے دفتر میں کب ملازمت کی؟ اس اخبار کے ناشر **منشی رام اگروال** نے **احمد دین** کی متعدد کتابیں شائع کی ہیں، لیکن کسی پر سالِ طباعت درج نہیں ہے۔ اخبار 'وطن' (لاہور) کے ۱۹۰۸ء کے متعدد شماروں میں مذکورہ ناشر کی شائع کردہ تین سوانح عمریوں (مہاتما بدھ، رنجیت سنگھ، ابوالفضل) کا اشتہار ملتا ہے۔ یہ تینوں **احمد دین** کی تصانیف ہیں۔ اس اشتہار سے یہ واضح ہے کہ یہ تینوں کتابیں ۱۹۰۸ء سے قبل شائع ہو چکی تھیں۔ اس ناشر نے **احمد دین** کی کئی اور کتابیں بھی شائع کی تھیں، اشتہار میں ان کا ذکر نہ ہونے سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ۱۹۰۸ء تک شائع نہیں ہوئی تھیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ **احمد دین** ۸-۱۹۰۷ء میں یقینی طور پر 'اردو اخبار' سے وابستہ تھے، ممکن ہے کہ یہ تعلق مذکورہ زمانے سے دو تین سال قبل شروع ہوا ہو اور دو تین سال بعد تک قائم رہا ہو۔

احمد دین کی ملازمت کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ وہ 'اردو اخبار' کے لیے مضامین بھی لکھتے تھے اور اس ادارے کے لیے کتابیں بھی تحریر کرتے تھے۔ اس زمانے میں **احمد دین** نے جو کتابیں لکھیں، ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکی اور پھر اس ادارے کی طرف سے شائع ہونے والی بعض کتابوں پر مصنف کا نام بھی نہیں ہوتا تھا' مؤلفه ومرتبه كاكار پرداز انِ اردو اخبار' لکھا جاتا تھا۔ اس قسم کی ایک کتاب 'دوست محمد خاں' کے بارے میں، ثبوت ملا ہے (جس کی تفصیل آگے آئے گی) کہ یہ **احمد دین** کی تصنیف ہے۔ ممکن ہے ایسی اور کتابیں بھی شائع ہوئی ہوں، جن پر **احمد دین** کا نام بطورِ مصنف درج نہ ہو۔

انجمن حمایتِ اسلام

احمد دین[۶] کی سرگرمیاں صرف اپنے پیشہ ورانہ فرائض تک محدود نہ تھیں، وہ سماجی اور رفاہی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اس صدی کے ربع اول میں لاہور کی جو شخصیات سماجی و ادبی کاموں میں پیش پیش تھیں، ان میں **احمد دین** بھی شامل تھے۔ انجمن حمایتِ اسلام سے ان کا گہرا تعلق تھا، وہ ایک عرصے تک انجمن کی اسکولز سب کمیٹی اور تالیف وطبع کی سب کمیٹی

کے سیکرٹری رہے۔ سالہا سال تک اسلامیہ کالج (لاہور) کے سیکرٹری کی خدمت بھی انہی کے ذمہ رہی۔ **احمد دین**، انجمن کے ان ممتاز کارکنوں میں سے تھے جن کی کوششوں سے انجمن کو ایک قومی ادارے کی حیثیت حاصل ہوئی۔

احمد دین، انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں میں بھی نہایت دلچسپی لیتے تھے۔ وہ ان جلسوں میں تقریریں کرتے اور مقالے پڑھتے تھے۔ انجمن کے انیسویں سالانہ اجلاس کی روداد، میں جو ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی تھی، **احمد دین** کا ایک مضمون بہ عنوان 'راز و نیاز' شامل ہے۔ اس مضمون کے شروع میں مرتب نے یہ تعارفی نوٹ لکھا ہے:

دوسرا لکچر موسوم بہ 'راز و نیاز' انجمن کے ایک معزز کارکن مولوی احمددین صاحب بی اے پلیڈر کا تھا۔ گو مولوی صاحب کے ساتھ پبلک نے وہ سلوک نہیں کیا جو مولوی الف دین کے ساتھ برتا، تاہم نہایت افسوس ہے کہ ان کا عمدہ اور بے مثال لکچر بھی ادھورا رہا اور پورا نہ ہونے پایا۔ یہ لکچر بھی شاملِ روداد تھا۔

انجمن حمایتِ اسلام کے معاملات سے **احمد دین** کو جو گہرا تعلق تھا، اس کا اندازہ ایک واقعے سے ہوسکتا ہے کہ ۱۹۰۸ء میں انجمن میں اندرونی انتشار پیدا ہوا، اور اُس کے اراکین دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ 'طالبِ اصلاح' تھا اور دوسرا 'مخالفِ اصلاح'۔ آپس کے اختلافات کو ختم کرنے کے لیے ۳ر مئی ۱۹۰۸ء کو دونوں گروہوں نے ایک 'مصالحتی اجلاس' منعقد کیا، جس میں دونوں طرف کے پانچ پانچ وکلا نے شرکت کی۔ ان وکلا میں **احمد دین** بھی شامل تھے جو 'طالبِ اصلاح' گروہ سے تعلق رکھتے تھے، اخبار وطن (لاہور) کی ۱۵ر مئی ۱۹۰۸ء کی اشاعت میں 'مصالحتی اجلاس' کی جو رپورٹ شائع ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں گروہوں نے آپس کے اختلافات ختم کر دیے۔

انجمن کے ایک ایسے ہی تنازعے کا ذکر **مولانا عبدالمجید سالک** نے بھی کیا ہے:

...انجمن میں اختلافات وتنازعات بہت بڑھ گئے تھے اور مقدمہ بازی تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ پیسہ اخبار' ۳۰/اپریل ۱۹۱۰ء میں ایک اطلاع درج ہے کہ ۲۲/اپریل کی شام کو نواب فتح علی خاں قزلباش کے دولت کدے پر آنریبل محمد شفیع، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، مولوی احمد دین، شیخ گلاب دین، مولوی محبوب عالم، میاں فضلِ حسین، چودھری نبی بخش، مولوی فضل الدین، میاں نظام الدین اور مولوی کریم بخش جمع ہوئے... [۸]

انجمن کشمیری مسلمانان

انجمنِ کشمیری مسلمان سے بھی **احمد دین** کا گہرا تعلق تھا۔ وہ اس انجمن کے بانیوں میں سے تھے یہ انجمن ان کشمیری مسلمانوں نے قائم کی تھی جو کشمیر سے نکل کر پنجاب میں مستقل طور پر آباد ہو گئے تھے اور اس کا مقصد کشمیری مسلمانوں کی فلاح و بہبود تھا۔ **علامہ اقبال** بھی اس انجمن کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہتے تھے۔ **محمد عبداللہ قریشی** نے **اقبال** اور انجمن کشمیری مسلمانان کے تعلق پر اپنے ایک مقالے[۹] میں تفصیل سے لکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ جب ڈھاکے کے نواب **خواجہ سلیم اللہ** امرتسر آئے تو ۲۷/دسمبر ۱۹۰۱ء کو ان سے انجمن کا ایک وفد ملا۔ **احمد دین** بھی اس وفد میں شامل تھے۔ [۱۰]

دیگر اداروں سے تعلق

احمد دین، لاہور میونسپل کمیٹی کے مسائل سے بھی دلچسپی لیتے تھے۔ انھیں حکومت نے میونسپل کمشنر نامزد کیا تھا۔ وہ اس ادارے کی مالیاتی کمیٹی کے چیئرمین بھی تھے۔ وہ

پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ کے بھی ایک عرصے تک سرگرم رکن رہے۔ وہ یونیورسٹی کے **ایل ایل بی** کے امتحانات کے ممتحنِ اعلیٰ کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ (قلمی یادداشت از: **خواجہ اعجاز احمد**)

لاہور کی ادبی محفلیں

احمد دین کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز گورنمنٹ کالج (لاہور) میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہو چکا تھا، جہاں انھیں **مولانا محمد حسین آزاد** سے قریب رہنے اور اُن سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے **حکیم امین الدین** کے مکان پر منعقد ہونے والی ادبی محفلوں میں شرکت شروع کی، ان محفلوں نے ان کے ادبی ذوق کو مزید جلا دی۔ ان محفلوں کو گزشتہ صدی کے آخری چند برسوں کے لاہور کی ادبی سرگرمیوں کا مرکز سمجھنا چاہیے۔

۱۸۹۵ء میں **حکیم احمد شجاع** کے والد **حکیم شجاع الدین** نے ایک ماہانہ مشاعرے کا آغاز کیا۔ یہ مشاعرہ **حکیم امین الدین** کے مکان پر منعقد ہوتا تھا اور اس کی روداد ماہانہ گلدستے 'شورِ محشر' میں شائع ہوتی تھی۔ 'شورِ محشر' کے اولین شمارے میں جو روداد شائع ہوئی تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا مشاعرہ ۳۰ر نومبر ۱۸۹۵ء کو منعقد ہوا تھا۔[۱۱] اس میں لاہور کے بہت سے اہلِ علم اور شعرا نے شرکت کی تھی۔ **احمد دین** بھی اس میں شریک ہوئے تھے۔[۱۲] مشاعروں اور ادبی محفلوں کا یہ سلسلہ ۱۹۲۲ء تک قائم رہا۔ **احمد دین** باقاعدگی سے ان محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ خود انھوں نے ایک جگہ ان محفلوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

> انیسویں صدی کے آخری عشرہ نصف سے زیادہ گزر چکا تھا۔ شہرِ لاہور کے بھاٹی دروازے کے اندر بازارِ حکیماں میں ایک مشاعرے کی طرح ڈالی گئی۔ مجلسِ مشاعرہ حکیم امین الدین صاحب بیرسٹر مرحوم کے مکان پر، جو اُسی خاندانِ حکیماں کے ایک نامور رکن تھے جن کے

نام پر بازار مشهور ھے، منعقد ھوا کرتی تھی۔ میرِ مجلس اسی خاندان کے بزرگ حکیم شجاع الدین صاحب مرحوم تھے۔ میرزا ارشد گورگانی دھلوی ومیر ناظر حسین ناظم لکھنوی مشاعرے کی روحِ رواں تھے۔ دونوں حضرات خود بھی شعر کھا کرتے تھے اور ان کے شاگردوں اور ثنا خوانوں کی ایک دوسرے کے مقابلے میں طبع آزمائیاں مشاعرے کی رونق کو دوبالا کرتی تھیں۔ دلّی اور لکھنؤ کے اکھاڑے تھے۔ تماشائیوں کا ایک اچھا خاصا جمگھٹا ھوتا تھا۔ کالجوں کے نوجوان طالب علم بھی شعر گوئی اور شعر فھمی کے شوق میں چلے آتے تھے اور سخن دانی کے داد لینے اور دینے میں کسی سے پیچھے نہ رھتے تھے۔[۱۳]

اس زمانے کا دوسرا بڑا ادبی مرکز **حکیم امین الدین** کے چچازاد بھائی **حکیم شاہباز دین** کا مکان تھا۔اس کے بارے میں **احمد دین لکھتے** ہیں:

حکیم شاھباز دین مرحوم... نھایت ھی دُبلے پتلے آدمی تھے لیکن اللہ میاں نے اس مختصر جسم میں ایک ایسا دل رکھ دیا تھا جو اسلامی اخوت اور محبت کے جوش سے ھر وقت لبریز رھتا تھا۔ خاطر داری اور مھمان نوازی کا شیوہ اور خدمت اور ھمدردی ان کی جبلّت تھی۔ ان کے فضائلِ حسنہ نے ان کے مکان کو ایک کلب گھر

بنادیا تھا۔ شہر کے با مذاق اصحاب یہاں جمع ہوتے تھے۔ حکیم صاحب کی چاہ اور چائے اور اہلِ محفل کی نکتہ سنجیاں قومی تحریکوں میں دلچسپی لینے والوں کو اِس مکان پر کشاں کشاں لیے آتی تھیں۔ [۱۴]

ان محفلوں میں جو لوگ باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے ان میں **مولوی احمد دین، شیخ گلاب دین، مفتی عبداللہ ٹونکی، مولانا محمد حسن جالندھری، مولوی اصغر علی روحی، سید محمد شاہ وکیل، سر عبدالقادر، سر شہاب الدین، سر محمد اقبال، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، خلیفہ نظام الدین** اور **ماسٹر مولا بخش** کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ اس محفلِ احباب میں کبھی کبھی **سر محمد شاہ دین، سر محمد شفیع، فقیر افتخار الدین** اور **مرزا سلطان احمد** بھی آ پہنچتے تھے۔ [۱۵] پیسہ اخبار' والے **منشی محبوب عالم** بھی ان محفلوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔ انہی محفلوں میں **احمد دین** کی ملاقات ایسے لوگوں سے ہوئی جنھوں نے ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے لیے راستہ ہموار کیا۔

وفات

حکیم احمد شجاع کے بیان کے مطابق، **احمد دین** زندگی کے آخری چند برسوں میں مسلسل بیمار رہے۔ پاؤں کے چنبل کی وجہ سے وہ گھر سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ **احمد دین** کے فرزند **خواجہ اعجاز احمد** کا بیان ہے کہ ۱۹۲۶ء میں ان کے والد پر فالج کا حملہ ہوا، اور اس وقت تک ان کی چنبل کی شکایت دور ہو چکی تھی۔ انھوں نے فالج کے مرض میں پونے تین سال مبتلا رہ کر ۹/اکتوبر ۱۹۲۹ء کو وفات پائی، انھیں **میانی صاحب** لاہور کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

اخبار حمایتِ اسلام (لاہور) کے ۱۷/اکتوبر ۱۹۲۹ء کے شمارے میں **احمد دین کی** وفات کی خبر ان الفاظ میں شائع ہوئی تھی:

دِلی رنج و افسوس کے ساتھ یہ خبر حوالۂ قلم کی جاتی ہے کہ انجمن کے مخلص کارکن و حامی

وهمدرد مولوی احمد دین صاحب وکیل نے ایك
مدت کی علالت کے بعد ۱۱/اکتوبر ۱۹۲۹ء کو داعیِ
اجل کو لبیك کہا۔ [۱۶]

۱۱/اکتوبر کی تاریخ درست نہیں ہے۔اس کا ثبوت تو **علامہ اقبال** کا وہ تعزیتی خط ہے جو آیندہ اوراق میں درج کیا گیا ہے۔ یہ خط ۱۱/اکتوبر کا مکتوبہ ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وفات دو روز قبل ہوچکی تھی، دوسرا ثبوت یہ ہے کہ بقول **خواجہ اعجاز احمد** قبرستان **میانی صاحب** کے ریکارڈ میں جو تاریخِ وفات درج ہے، وہ ۹/اکتوبر ہے۔

احباب

احمد دین کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔سرِفہرست **علامہ اقبال** تھے۔جن دوسرے لوگوں سے گہرے تعلقات تھے، ان میں **سر فضلِ حسین**، **خلیفہ نظام دین**، **حکیم شاہباز دین**، **مولوی محبوب عالم**، [۱۷] **خواجہ کریم بخش**، **خواجہ رحیم بخش**، **حکیم امین الدین**، **شیخ گلاب دین**، **سید محمد شاہ وکیل**، ڈاکٹر **مرزا یعقوب بیگ**، **رائے بہادر پنڈت درگاہ داس وکیل**، **سر عبدالقادر**، **سر محمد شفیع**، **چودھری شہاب الدین**، **رائے بہادر پنڈت جوالا پرشاد وکیل** اور **سردار ہرنام سنگھ** (وکیل) تھے۔ڈاکٹر **مرزا یعقوب بیگ**، **احمد دین** کے بچپن کے دوست تھے۔**ڈاکٹر صاحب** کے بھتیجے **مرزا مسعود بیگ** نے 'آئینہ صدق وصفا' کے نام سے ڈاکٹر کی سوانح عمری لکھی ہے۔اس میں وہ صاحبِ سوانح اور **احمد دین** کے تعلقات کے بارے میں لکھتے ہیں:

عمِّ مرحوم (ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ) کے بڑے
عزیز دوستوں سے ایك بزرگ مولوی احمد دین
وکیل تھے جو بازارِ حکیماں اندرون بھائی
دروازہ میں رہایش رکھتے تھے۔ یہ علامہ اقبال
کے بھی ابتدائی دوستوں میں سے تھے اور علامہ
کے ابتدائی دَور کی ادبی اور شعری مجالس کے

پُرجوش ممبر تھے۔ اقبال پر سب سے پہلی تصنیف بھی انھی مولوی احمد دین مرحوم کی لکھی ہوئی ہے۔ زندگی کے آخری چند سالوں میں مولوی صاحب مرحوم ایك طویل بیماری میں مبتلا رہے اور عمِّ مرحوم اکثر انھیں دیکھنے جایا کرتے تھے اور ایك دو مرتبہ مجھے بھی ان کے ہمراہ جانے کا اتفاق ہوا۔ ایك دن آپ نے مولوی صاحب موصوف سے اپنے پرانے تعلقاتِ مودّت اور زمانہِ طالبِ علمی کی باتیں سنائیں اور احساس شناسی کے رنگ میں بیان فرمایا کہ میں مولوی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری ایك لغو عادت کی اصلاح کی تھی۔ فرمانے لگے کہ زمانہِ طالبِ علمی میں مجھے ناول پڑھنے کی بہت عادت تھی اور اپنی درسی کتابوں کو چھوڑ کر میں اِن بازاری ناولوں کے مطالعے میں وقت ضائع کیا کرتا تھا۔ مولوی احمد دین صاحب عمر میں چند سال مجھ سے بڑے تھے اور ایك بڑے بھائی کی طرح میری حرکات وسکنات کی نگرانی بھی کیا کرتے تھے۔ ابتدا اِن تعلقات کی یوں ہوئی کہ مرزا صاحب مرحوم کے والد صاحب لاہور میں علاقہ میاں میر کی نہر پر ضلع دار تھے اور اندرونِ شہر لوہاری منڈی میں ان کی سکونت تھی۔ ان کی ہمسائیگی میں

مولوی احمد دین صاحب کے والد ڈاکٹر اللہ دین کی رہایش تھی جو جیل میں ڈاکٹر تھے۔ ۱۸۹۰ء میں جب مرزا صاحب کے والد صاحب کی تبدیلی ضلع ملتان میں ہوگئی تو وہ اپنے بچوں کو تعلیم کے لیے لاہور ہی چھوڑ گئے اور ان کے پرانے احباب وقتاً فوقتاً ان کی خبرگیری کرتے رہتے تھے۔ اس تعلق کی بنا پر مولوی احمد دین صاحب نے ایک مرتبہ عمِّ مرحوم کی ناولوں سے بہت شغف کرتے دیکھا تو اپنے دوست کو یہ عادت ترک کرنے پر مائل کیا۔ بظاہر یہ ایک معمولی سی بات ہے لیکن مرزا یعقوب بیگ عمر بھر مولوی صاحب کے احسان مند رہے اور ان کی اس نیکی کو یاد کرتے رہے۔ [۱۸]

فقیر وحیدالدین نے بتایا کہ ان کے والد **فقیر سید نجم الدین** اور **مولوی احمد دین** میں بھی دوستانہ مراسم تھے۔ [۱۹]

شخصیت

احمد دین کی شخصیت بڑی پُرکشش تھی۔ وہ اپنی گوناگوں صفات کی وجہ سے اپنے جاننے والوں کے حلقے میں بہت مقبول تھے۔ ان میں ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، دوسروں کے کام آنے میں وہ اپنے پرائے کی تمیز روا نہ رکھتے تھے۔ ان کی ذات قدیم تہذیب کا بہترین نمونہ تھی، لیکن وہ جدید زمانے کے تقاضوں سے بھی بے خبر نہیں تھے، خصوصاً علوم وفنون کے سلسلے میں ان کی رائے یہ تھی کہ ہمیں اہلِ مغرب سے پوری طرح استفادہ کرنا چاہیے، لیکن محض نقالی کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے **احمد دین** کو دیکھا تھا اور جن کے ذہن میں ان کی بہت سی یادیں محفوظ ہیں۔ [۲۰]

حکیم احمد شجاع، راقم الحروف کے نام خط مورخہ: ۷؍فروری ۱۹۶۶ء میں لکھتے ہیں:

مولوی احمد دین، مولوی تاج دین اور میرے عم زاد بھائی حکیم امین الدین نے ایک دایہ کا دودھ پیا تھا، اور اس لیے ان تینوں بزرگوں کی آپس میں بھائیوں بھائیوں کی سی محبت تھی... میں ذاتی طور پر مولوی احمد دین صاحب کی اس محبت اور شفقت کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ جو میرے والدِ مرحوم کی وفات کے بعد میرے ایامِ طفولیت سے لے کر اُس وقت تک، جب تک وہ زندہ رہے، میری زندگی کا بہت بڑا سہارا رہی۔ میری کامیابی پر خواہ وہ کسی امتحان میں ہو یا ملازمت کے سلسلے میں، انھوں نے ہمیشہ ایسی مسرت کا اظہار کیا کہ ان کا یہ خلوص میرے لیے باپ کے سایہ عاطفت کا نعم البدل بن گیا۔

مولانا غلام رسول مہر اپنے مکتوب بنام راقم الحروف مورخہ: ۱۳؍مارچ ۱۹۶۶ء لکھتے ہیں:

میں ۱۹۱۱ء میں بسلسلۂ تعلیم لاہور آیا تھا۔ اس زمانے میں مولوی احمد دین مرحوم، اقبال کے خاص احباب میں شمار ہوتے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں دوبارہ یہاں آیا تو ان کے اور شیخ گلاب دین کے بارے میں سنا جاتا تھا کہ انھیں اقبال سے خصوصی تعلق ہے۔ مولوی احمد دین سے کبھی بات چیت نہیں ہوئی۔ البتہ انھیں دور سے کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ بالکل کم گو تھے۔ عام روایت یہ

تھی کہ سول مقدمات میں انھیں کمال مہارت حاصل ھے۔ پوشش ھمیشہ سادہ دیکھی۔ پاجامہ لٹّھے کا، چھوٹا کوٹ، سر پر ترکی ٹوپی، چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی... اقبال کی ٹوپی بھی ترکی ھوتی مگر ھارڈ، مولوی احمد دین کی ٹوپی سافٹ اور ذرا سیاھی مائل رنگ کی ھوتی تھی۔ بھرحال مولوی صاحب بڑے متین، سنجیدہ، کم گو بزرگ تھے۔

خواجہ اعجاز احمد نے اپنے والد کی شخصیت کو ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے:

مولوی احمد دین اوائل عمر سے علم وادب کا شغف رکھتے تھے اور کتب بینی کا اتنا شوق تھا کہ اردو ادب، انگریزی ادب، فارسی ادب اور عربی کی بے شمار کتب ان کی لائبریری میں موجود تھیں... مولوی صاحب کے انتقال کے بعد گھریلو نظام کچھ اس قدر درھم برھم ھوا کہ ان میں سے بیش تر کتابیں خواجہ سعید احمد، جو مولوی صاحب کے بڑے لڑکے تھے، وہ لے گئے... لیکن بدقسمتی سے پاکستان بننے سے چند مھینے خواجہ سعید صاحب کا اچانك دل کی حرکت بن ھونے سے انتقال ھوگیا۔ وہ ریلوے میں ملازم تھے اور ان دنوں انبالے میں متعین تھے.... ان کی بیوی اور بیٹا جب انبالے سے لاھور آئے تو اپنے ساتھ چند ضروری اشیا ھی لاسکے اور اس کے

فوراً بعد تقسیم ہند ہوگئی اور ان کا بیٹا بھی فوت ہوگیا۔ ان وجوہات کی بنا پر مولوی صاحب کی بیش بہا کتابوں کا خزانہ اور دیگر کاغذات تلف ہوگئے۔

مولوی صاحب کا اردو، فارسی اور انگریزی ادب کے علاوہ عربی زبان کا بھی کافی وسیع مطالعہ تھا ارو خاص طور پر قرآن پاک کے ترجمے اور تفسیر پر کافی عبور رکھتے تھے اور کئی موقعوں پر ڈاکٹر اقبال بھی مشورہ لیا کرتے تھے۔

مولوی صاحب کم گو، خود دار اور سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے۔ وہ بہت نیک دل اور ہمدرد انسان تھے۔ ان کی کنبہ پروری مشہور تھی۔ مولوی صاحب اور اُن کی اہلیہ غریب اقربا اور دوسرے ضرورت مند اشخاص کی کئی طریقوں سے حاجت روائی کرتے رہتے تھے۔ ان کے گھر میں تقریباً بیس پچیس افراد کا کھانا روزانہ ضرور تیار ہوتا تھا۔

مولوی صاحب کی زندگی کا معمول کچھ اس طرح سے تھا کہ وہ علی الصباح اٹھتے، صبح کی نماز پڑھتے، تلاوتِ قرآن کرتے اور پھر منٹو پارک (اقبال پارک) میں سیر کے لیے چلے جاتے۔ وہاں ان کے چند وکیل احباب موجود ہوتے، جن

سے مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات کرتے۔ وہاں سے واپس آکر ناشتہ کرتے جو اکثر لسّی اور پوری حلوہ ہوتا تھا۔

اس کے بعد وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اپنے آفس میں بیٹھ کر اُس دن کے مقدمات کی تیاری کرتے اور تقریباً نو ساڑھے نو بجے وہ کھانا کھاکر اپنے گھریلو تانگے پر سوار ہوکر ضلع کچہری جاتے۔ وہاں سے چار بجے کے بعد گھر واپس آکر کشمیری چائے کے ساتھ ہلکی پھلکی چیزیں نمک پارے وغیرہ کھاتے اور پھر کچھ دیر آرام کرکے وہ اپنی بیٹھک میں چلے جاتے۔ وہاں شام کے قریب ان کے چند احباب اکثر آتے اور وہ اکٹھے بیٹھ کر گپ شپ لگایا کرتے۔ ڈاکٹر اقبال اگرچہ اپنے دوستوں کے ہاں کم جایا کرتے تھے لیکن وہ مولوی صاحب کے ہاں تبادلۂ خیالات کے لیے آتے رہتے تھے اور کشمیری چائے بڑے شوق سے پیا کرتے تھے، مولوی صاحب علاوہ اُن دنوں کے جن میں ادبی مجلسیں ہوا کرتی تھیں، رات کا کھانا کھانے کے بعد دو تین گھنٹے اپنا ادبی شوق پورا کیا کرتے تھے اور اس کے بعد گیارہ بارہ بجے کے قریب سوجایا کرتے تھے۔ ان کی مصروفیات کچھ اس قسم کی ہوتی تھی کہ ان کے پاس گھریلو اور نجی معاملات میں حصہ لینے کی کوئی فرصت نہ

هوتی تهی جس کی وجه سے ان کی اهلیه هی تمام
گھریلو کام انجام دیتی تهیں۔ (قلمی یادداشت)

اولاد

احمد دین نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ دوسری بیوی سے چار لڑکے اور ایک لڑکی۔ ان میں سے تین بیٹے **خواجہ ریاض احمد، خواجہ امتیاز احمد** اور **خواجہ اعجاز احمد** اور ایک بیٹی **محمود ممتاز** موجود ہیں۔ اور باقی سب کا انتقال ہو چکا ہے۔ **خواجہ ریاض احمد** تقریباً پینتیس برس تک اسلامیہ کالج لاهور سے وابستہ رہے ہیں۔ **خواجہ امتیاز احمد** پنجاب آڈٹ ڈیپارٹمنٹ میں ڈائرکٹر تھے۔ **خواجہ اعجاز احمد** محکمۂ امورِ حیوانات میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ یہ تینوں حضرات ملازمتوں سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ (۱) ایک صاحبزادے کا نام **بشیر احمد** تھا۔ ان کے بارے میں **مولانا غلام رسول** لکھتے ہیں:

... مولوی بشیر احمد شیخ مبارك علی كے پاس
برسوں كام كرتے رهے۔ وه بهی پیكرِ خلوص تهے،
بے مثال لطیفه باز، كهانا پكانے میں ایسے مشاق
تهے كه میں نے زندگی میں ویسا كوئی نه
دیكھا... تقسیم سے كئی برس بیش تر وفات
پائی۔
(مكتوب بنام راقم الحروف، مورخه: ۱۳ر مارچ
۱۹۶۶ء)

بشیر احمد کے بارے میں **خواجہ اعجاز احمد** 'قلمی یادداشت' میں لکھتے ہیں:

والد صاحب كے بهت قریب تهے اور اكثر ڈاكٹر
اقبال كے هاں بهی كئی معاملوں كی گفت وشنید

(۱) یہ مقالہ ۲۴ برس پہلے لکھا گیا تھا۔ اس دوران میں خواجہ ریاض احمد اور خواجہ امتیاز احمد کا انتقال ہو چکا ہے۔

کے لیے جایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مولوی
صاحب کی کتابوں کی نشر واشاعت کا کام
خواجہ بشیر احمد ھی کے سپرد تھا جسے وہ
خوش اُسلوبی سے سر انجام دیتے رھے۔

احمد دین کے ایک اور بیٹے **خواجہ نیاز احمد** تھے جو پہلے وکالت کرتے تھے اور پھر محکمۂ پولیس میں پراسیکیوٹنگ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ایک صاحب زادے کا نام **خواجہ سعید احمد** تھا، ان کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ یہ بھی اپنے والد کی طرح علمی وادبی ذوق رکھتے تھے۔

لاھور سے عشق

احمد دین کو لاھور سے عشق تھا۔ اگرچہ انھیں لاھور سے باہر جانے کے مواقع ملے اور ایک بار وہ گجرانوالہ گئے بھی، لیکن لاھور سے باہر مستقل قیام انھیں گوارا نہیں تھا۔ وہ اس شہر کی تہذیبی قدروں کے دلدادہ تھے اور یہ تعلق کچھ اس حد تک بڑھا کہ وہ خود لاھور کی تہذیبی زندگی کی علامت بن گئے۔ لاھور سے وہ بہت کم باہر نکلتے تھے۔ البتہ کشمیری الاصل ہونے کی وجہ سے ہر سال ستمبر کے مہینے میں جب عدالتوں کی تعطیلات ہوتی تھیں، وہ کشمیر ضرور جاتے تھے۔

لاھور میں پہلے پہل ان کا قیام سوتر منڈی میں تھا۔ پھر لوھاری منڈی میں رہے۔ بعد ازاں بازار حکیماں میں لال حویلی کے سامنے کے مکان میں قیام کیا۔ آخر میں اسی بازار کی ایک ملحقہ گلی میں **فقیر سید نجم الدین** کے گھر کے عین سامنے ایک مکان میں منتقل ہو گئے اور اسی مکان میں ان کا انتقال ہوا۔ وکالت کے سلسلے میں انھوں نے اپنا دفتر لوھاری منڈی میں پھولوں والی گلی کے سامنے ایک مکان میں قائم کیا تھا۔

اقبال سے تعلقات

احمد دین اور **اقبال** کے تعلقات کی داستان دراصل دو ایسے دوستوں کے ربطِ باہم کی روداد ہے جو آپس میں محبت بھی کرتے تھے اور ایک دوسرے کا احترام بھی ملحوظ رکھتے تھے۔ ان کی دوستی ہر اعتبار

سے مثالی تھی۔ آغازِ تعلقات سے لے کر **احمد دین** کی وفات تک، دونوں میں گہرے اور مخلصانہ مراسم رہے، ایک آدھ مرتبہ کچھ کشیدگی بھی پیدا ہوئی، لیکن وہ بھی جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، حد سے بڑھی ہوئی محبت کا نتیجہ تھی۔

اقبال احمد دین سے چند برس چھوٹے تھے، لیکن دونوں کے مشترک علمی و ادبی مذاق و مزاج کی ہم آہنگی نے عمر کے اس فرق کو ختم کر دیا تھا۔ ویسے بھی دوستی سن و سال کی نہیں، ہم مذاقی و ہم مشربی کی پابند ہوتی ہے۔ ان دونوں کے گہرے تعلقات کی کچھ اور وجوہ بھی ہیں۔ مثلاً دونوں کشمیری الاصل تھے اور اس طرح قدرتی طور پر دونوں میں ایک دوسرے کے لیے کشش تھی۔

اسی بنا پر دونوں نے انجمن کشمیری مسلمان کے ذریعے اپنی برادری کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا۔ دونوں ہم پیشہ تھے اور قانون دان کی حیثیت سے اپنی اپنی جگہ ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ **اقبال** کو اپنے ذاتی معاملات میں **احمد دین** کی قانونی قابلیت سے فائدہ اٹھانے کی بارہا ضرورت پیش آئی اور اس تعلق نے بھی دوستی کی بنیادوں کو مضبوط سے مضبوط تر کیا۔ دونوں کا انجمن حمایتِ اسلام سے بھی گہرا تعلق تھا اور یہ انجمن بھی ان کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانے کا ذریعہ بنی۔ اس طرح مختلف عناصر نے مل کر **اقبال** اور **احمد دین** کو ایک دوسرے سے قریب کیا اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ قربت خلوت و جلوت کے ہر مرحلے میں بڑھتی چلی گئی۔

اوپر بازارِ حکیماں کی ادبی محفلوں کا ذکر آچکا ہے۔ اُنہی محفلوں میں **اقبال** اور **احمد دین** ایک دوسرے کے قریب آئے۔[۲۱] **اقبال** کا یہ طالب علمی کا زمانہ تھا اور **احمد دین** تعلیم ختم کر کے عملی زندگی میں نہ صرف داخل ہو چکے تھے، بلکہ علمی و ادبی حلقوں میں خاصی شہرت بھی حاصل کر چکے تھے۔ دونوں کے تعلقات تقریباً ۳۴، ۳۵ برسوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ادبی سطح پر **اقبال** کو متعارف کرانے میں اُن کے دوستوں کی کوششوں کو بھی خاصا دخل رہا ہے۔ ان دوستوں نے **اقبال** کو ادبی حلقوں سے متعارف کرایا، ان کے کلام کو عام جلسوں اور رسالوں وغیرہ کے ذریعے عوام تک پہنچایا، ان کی شاعری کے بارے میں تعارفی مضامین اور کتابیں لکھیں۔ **احمد دین** بھی **اقبال** کے ایسے دوستوں میں شامل تھے۔ **اقبال** کی شاعری پر جس شخص نے اردو میں سب سے پہلے قلم اٹھایا اور ایک مفصل تنقیدی جائزہ پیش کیا، وہ **احمد دین** ہی تھے۔

علمی وادبی معاملات سے قطع نظر، دونوں ایک دوسرے کی ذاتی زندگی میں بھی بڑی حد تک دخیل تھے۔ **احمد دین**، **اقبال** کی ابتدائی زندگی کے تمام 'خفی وجلی' پہلوؤں سے پوری طرح واقف تھے۔ **اقبال** کے ایک قدیم دوست **مرزا جلال الدین** بیرسٹر نے رقص وسرور کی محفلوں سے متاثر ہوکر **اقبال** کے شعر کہنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: 'میری ملاقات سے پیش تر مولوی احمد دین صاحب نے کئی ایسے مواقع کا ذکر کیا ھے۔'[۲۲] **مرزا جلال الدین** رقص وسرور سے **اقبال** کی دلچسپی کے بارے میں لکھتے ہیں: 'میں نے بھی مولوی احمد دین مرحوم سے ان کی داستان سن رکھی تھی۔'[۲۳] ان بیانات سے **احمد دین** اور **اقبال** کی بے تکلفی نیز تعلقات کی گہرائی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اقبال کی دوسری (والدہ **جاوید اقبال** کے ساتھ) اور تیسری شادی میں جن چند قریبی احباب نے شرکت کی، ان میں **احمد دین** بھی شامل تھے۔[۲۴]

علامہ اقبال، جیسا کہ کہا جاچکا ہے، **احمد دین** کی قانونی مہارت کے بھی قائل تھے۔ وہ مقدمات کے سلسلے میں **احمد دین** سے مدد لیتے رہتے تھے۔ اس قسم کے ایک مقدمے کا ذکر **محمد عبداللہ قریشی** نے کیا ہے۔ جون ۱۹۲۱ء میں ایک معاملے میں **منشی سراج الدین** نے قانونی مشورے کے لیے **علامہ اقبال** کو کشمیر بلایا۔ وہ اپنے ساتھ مولوی **احمد دین** کو بھی لے گئے اور تقریباً دو ہفتے تک سری نگر میں رہے۔ مقدمے کے کام سے فارغ ہوکر **اقبال** اور **احمد دین** نے بہت سا وقت سیر وتفریح میں گزارا۔[۲۵]

خواجہ اعجاز احمد نے کشمیر جانے کے واقعے کا سال ۱۹۲۴ء بتایا ہے۔ وہ قلمی یادداشت میں لکھتے ہیں:

> ۱۹۲۴ء میں جب ڈاکٹر اقبال کشمیر گئے تو اس دوران میں سری نگر میں ڈاکٹر اقبال اور مولوی صاحب کی علاحدہ علاحدہ ھاؤس بوٹیں تھیں۔ اکثر ان کے احباب ڈاکٹر اقبال سے ملاقات کے لیے آتے رھتے تھے اور شعر وسخن کی مجلس گرم

رهتی تهی۔ انهیں دنوں میں احباب کی فرمایش
پر ڈاکٹر اقبال نے ڈل لیك پر فی البدیه نظم کهی۔

خواجہ اعجاز احمد اس سلسلے میں مذکورہ یادداشت میں مزید لکھتے ہیں:

برادرم خواجه امتیاز احمد صاحب نے مئی ۱۹۲۴ء
میں میٹرك کا امتحان پاس کیا اور جون میں
قبله والد صاحب کا پروگرام... سری نگر کا بن
گیا اور وه برادرم امتیاز احمد کو بهی ان کی
امتحان میں کامیابی کی خوشی میں اپنے همراه
سری نگر لے گئے۔

محمد عبداللہ قریشی کے بیان کی تائید **علامہ اقبال** کے ایک خط سے بھی ہوتی ہے۔ **منشی سراج الدین** کے نام مکتوب مورخہ: ۱۱/جولائی ۱۹۲۱ء میں **اقبال** لکھتے ہیں:

آپ سے رخصت هوکر پانچ بجے شام راولپنڈی
میں پهنچ گئے اور چهے بجے شام کی ٹرین بهی
مل گئی۔ رستے میں خدا کے فضل سے کوئی
تکلیف نهیں هوئی۔ آپ کی مستعدی، خدمت
گزاری اور مهمان نوازی کی تعریف کرتے کرتے
منزل ختم هوگئی۔[۲۶]

اس صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ **خواجہ اعجاز احمد** کو **اقبال** کے سفرِ کشمیر کا صحیح سنہ یاد نہیں رہا۔ **خواجہ اعجاز احمد** ہی کا بیان ہے کہ **احمد دین** ہر سال کشمیر جاتے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں بھی وہ ضرور گئے ہوں گے، لیکن **اقبال** کے ساتھ کشمیر جانے کا واقعہ ۱۹۲۱ء کا ہے۔ ۱۹۲۴ء میں **اقبال** کے کشمیر جانے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

بعض لوگ **اقبال** کا کلام بلا اجازت چھاپ لیتے تھے۔ انھوں نے ایسے لوگوں پر مقدمہ چلانے کا کام **احمد دین** کے سپرد کر رکھا تھا۔ بلا اجازت کلام چھاپنے والوں میں ایک صاحب **منشی قمر**

الدین تھے۔ان صاحب کے بارے میں **اقبال** اپنے ایک خط بنام **محمد الدین فوق** مورخہ:۹/مارچ ۱۹۱۷ء میں لکھتے ہیں:

> اس سے پیش تر میں اِس شخص (منشی قمر الدین) پر مقدمہ دائر کرنے کو تھا مگر مولوی ظفر علی خاں کے کہنے پر باز رہا۔ اس نے اس سے پیش تر میری نظموں کو میری اجازت کے بغیر شائع کردیا تھا۔ اب یہ سب معاملہ مولوی احمد دین وکیل کے سپرد کیا ھے کہ اگر کوئی میرا کلام میر ی اجازت کے بغیر چھاپے تو اس پر دعویٰ کردیا جائے۔[۲۷]

احمد دین زندگی کے آخری چند برسوں میں بیمار رہے،اس وجہ سے وہ کہیں آ جا نہیں سکتے تھے۔ **اقبال** ان کی مزاج پرسی کے لیے اکثر اُن کے مکان پر جاتے رہتے تھے۔ جب **احمد دین** کا انتقال ہوا تو **اقبال** پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے جنازے میں شریک نہ ہو سکے۔انھوں نے **احمد دین** کے فرزند **خواجہ بشیر احمد** کے نام ایک تعزیتی خط لکھا، یہ خط ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔[۲۸]

> عزیزم بشیر۔ السلام علیکم
>
> افسوس ھے کہ مولوی صاحب کے جنازے میں شریک نہ ہوسکا۔ مجھے اس سے دو ایک روز پہلے نقرس ہوگیا جس کی وجہ سے پاؤں میں سخت تکلیف تھی۔ حرکت سے قاصر رہا۔ دوسرے روز دانت کے درد کا پھر اضافہ ہوگیا۔ میں نے خواجہ صاحب[۲۹] کے ہمدست آپ کو اپنی معذوری کا پیغام بھی بھیجا تھا۔ بھرحال مجھے افسوس تازیست رہے گا کہ مرحوم کے لیے آخری دعا جو

کی گئی میں اس میں شریك ہونے سے محروم رہا۔ خدائے تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت کرے اور آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ کل آپ کے ہاں حاضر ہونے کا قصد تھا، مگر اس سے پہلے انجمن کے جلسے میں دیر ہوگئی۔ ان شاء اللہ اب حاضر ہوں گا۔ امید ہے شام کے قریب آپ سب بھائی گھر پر ہوتے ہوں گے۔ زیادہ کیا عرض کروں سوائے دعائے صبرِ جمیل کے۔

والسلام

محمد اقبال

اقبال اور احمد دین کی دوستی کے بارے میں حکیم احمد شجاع لکھتے ہیں:

اقبال اور مولوی احمد دین کے تعلقات بہت قریبی تھے اور مخلصانہ تھے۔ مولوی صاحب اقبال سے دلی محبت رکھتے تھے اور ان کے کلام سے ان کو بڑا لگاؤ تھا۔ اقبال بھی اگرچہ مولوی صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے نہ تھے لیکن ان کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے اور جو شعر اُن کی پسند کی کسوٹی پر پورا نہ اُترے اسے یا تو نظر انداز کردیتے تھے اور یا اُس پردوبارہ غور کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اقبال ہمیشہ اپنے ذاتی معاملات میں مولوی احمد دین سے مشورہ کرتے تھے اور اکثر انھیں کے مشورے پر عمل کرتے تھے۔ کئی معاملات میں یہ مشورے اقبال کے بڑے

کام آئے۔ جب مولوی احمد دین بہت زیادہ علیل
ہوگئے اور پاؤں کے چنبل کی وجہ سے چلنے
پھرنے کے قابل نہ رہے تو اقبال بلاناغہ ان کی
مزاج پرسی کے لیے میکلوڈروڈ کوٹھی سے بازارِ
حکیماں میں آیا کرتے تھے۔[۳۰]

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

...مولوی احمد دین مرحوم اقبال کے بڑے ہی
مخلص دوست تھے، ایسے دوست جیسے آج کل
دیکھنے میں نہیں آتے۔[۳۱]

اس محبت اور خلوص کے باوجود ایک مرتبہ ان دونوں دوستوں میں کچھ کشیدگی بھی پیدا ہوئی اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۲۳ء[۳۲] میں **اقبال** کے نام سے **احمد دین** نے ایک کتاب لکھی جس میں **اقبال** کی شاعرانہ حیثیت سے بحث کی گئی تھی۔ عام روایت یہ ہے کہ **اقبال** کو اس کتاب کی اشاعت پسند نہ آئی کیونکہ اس وقت تک ان کا پہلا **اردو مجموعہ کلام** بانگِ درا شائع نہ ہوا تھا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اس کتاب میں چوں کہ بہت سا کلام بھی شامل کرلیا گیا ہے، اس لیے یہ کتاب ان کے زیرِ ترتیب مجموعۂ کلام کی اشاعت و فروخت پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔ **احمد دین** کو **اقبال** کے ان خیالات کا جب علم ہوا تو انھوں نے غصے میں آکر کتاب کے تمام نسخے جلا ڈالے۔ دو نسخے کسی طرح بچ گئے جو **احمد دین** کے وارثوں کے پاس اب بھی موجود ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں مصنف نے از سرِ نو لکھی اور اسی سال طبع ہوئی۔ کتاب کی طبعِ اول کے جلائے جانے کے بارے میں بعض واقفِ حال حضرات کے بیانات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ **مولانا غلام رسول مہر** لکھتے ہیں:

اقبال کے متعلق کتاب مولوی صاحب نے مرتب
فرمائی تھی۔ اس میں ایسی نظمیں بھی شامل
تھیں جنھیں اقبال اپنے کلام سے خارج کرچکے
تھے۔ ایک کاپی دیکھ کر غالباً اقبال نے اسی خیال

سے ہلکے انداز میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا، بلاواسطہ نہیں بالواسطہ۔ مولوی صاحب نہایت مخلص دوست تھے، ان کے خلوص کا تقاضا یہ ہوا کہ سرسری بیان سنتے ہی مزید استفسار یا رُودر رُو گفتگو کا بھی انتظار نہیں کیا اور پوری کتاب جلوادی۔ صرف چند کاپیاں اس وقت تک تقسیم ہوئی تھی۔ پھر 'بانگِ درا' چھپ گئی تو از سرِ نو کتاب چھاپی، جس میں سے وہ کلام بیشتر خارج کر دیا تھا جسے اقبال خود خارج کرچکے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ اصل کاپی بھی دیکھی تھی۔ میرا، احساس یہی تھا کہ انھوں نے محض جذبۂ خلوص میں یہ قربانی کردی۔ ورنہ اس میں خارج کردہ کلام کی زیادہ مقدار شامل نہ تھی۔ [۳۳] اس سے زیادہ کلام انجمن (حمایتِ اسلام) کی سالانہ کارروائیوں میں نیز اخباروں اور رسالوں خصوصاً 'مخزن' میں چھپ چکا تھا۔ [۳۴]

حکیم احمد شجاع کی رائے میں اصل واقعہ یوں ہے:

(مولوی احمد دین) نے سب سے پہلے اقبال کو اُن کے اصلی روپ میں دیکھا اور ان کی شاعری کو اصلی رنگ میں سمجھا اور 'اقبال' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی اور اس میں اقبال کے وہ تمام اشعار جمع کیے جو بکھرے ہوئے موتیوں کی

طرح ابھی کسی لڑی میں نہ پروئے گئے تھے اور پھر اُن اشعار کی اس طرز پر تشریح کی جس پر مائنڈ اینڈ آرٹ آف شیسکپیئر ' لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب لاھور کے ایك نامور ناشر شیخ مبارك علی نے چھاپی۔[۳۵] لیکن ابھی یہ کتاب شائع نہ ھوئی تھی کہ اقبال کو اپنے کلام کے مجموعے کو شائع کرنے کا خیال پیدا ھوا اور یھی وہ مجموعہ ھے جس نے بعد میں بانگِ درا ' کی شکل اختیار کی مولوی احمد دین نے اس خیال سے کہ ان کی کتاب کی اشاعت سے بانگِ درا ' کی اشاعت کو نقصان پھنچے گا، اپنی کتاب خود ھی تلف کردی اور اس طرح دنیائے ادب ایك بڑی مفید تحقیقی یادداشت سے محروم ھوگئی۔[۳۶]

شیخ مبارک علی صاحب لاھور کی گزشتہ پون صدی کی علمی وتہذیبی زندگی کے ایک ایک پہلو سے پوری طرح واقف ہیں۔ کتابوں کی طباعت واشاعت ان کے لیے تجارت سے زیادہ ادبی وعلمی ذوق کی تسکین کا ذریعہ تھی۔ ان کی دکان ایک بہت بڑا علمی وادبی مرکز تھی جہاں شہر کے تمام اہلِ علم باقاعدگی سے جمع ہوتے تھے۔ **شیخ صاحب** کے **علامہ اقبال** اور دیگر اکابر سے بہت گہرے مراسم تھے۔ **مولوی احمد دین** سے بھی ان کے مخلصانہ تعلقات تھے۔ اقبال ' کی طباعتِ اول کے بارے میں راقم الحروف کے ایک استفسار کے جواب میں انھوں نے فرمایا:

مولوی احمد دین اور ڈاکٹر اقبال کے تعلقات ھمیشہ برادرانہ رھے، شیخ صاحب (اقبال) کسی اور دوست کے گھر کبھی نہ گئے۔ صرف مولوی احمد دین کی شخصیت ایسی تھی جھاں ڈاکٹر

صاحب کی کسی قدر بے تکلفی تھی، وہ ان کے ہاں وقتاً فوقتاً جایا کرتے تھے۔ چنانچہ انھیں تعلقات کی بنا پر اور کچھ عقیدت کے تحت مولوی صاحب مرحوم نے 'اقبال' لکھی۔ جس میں ڈاکٹر صاحب کے حالاتِ زندگی کے علاوہ ڈاکٹر مرحوم کی طویل نظمیں مثلاً **شکوہ، جوابِ شکوہ، فریادِ امت، طلوعِ اسلام** وغیرہ بھی آگئی تھیں۔ جب یہ کتاب ڈاکٹر صاحب قبلہ کے سامنے پیش کی گئی تو انھوں نے دیکھ کر یہ کہا کہ اِس کتاب کے ہوتے ہوئے میرے دوسرے کلام کے مجموعے کی کیا ضرورت ہے؟ بظاہر وہ ناراض نہ تھے۔ اس پر مولوی صاحب مرحوم نے اس کتاب کی کل کاپیاں نذرِ آتش کردیں کیونکہ ان کو ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں کافی دخل تھا، وہ نہیں چاہتے تھے کہ اقبال صاحب کا دل کسی طرح بھی میلا ہو۔ جب ڈاکٹر صاحب کو اس واقعے کا علم ہوا تو اُن کو اِس کا کافی صدمہ ہوا۔ اس کے کچھ عرصے بعد مولوی احمد دین نے اپنی کتاب 'سرگزشتِ الفاظ' لکھی جس پر ڈاکٹر اقبال نے سفارش کرکے مبلغ پانچ صد روپے انعام دلوایا... یہ کتاب (اقبال) مولوی صاحب نے ھی .... چھپوائی...اس کی طباعت وغیرہ کسی چیز میں ہمارے ادارے کا کوئی دخل نہ تھا۔

صرف ہمارے پاس اس کا کچھ وقت کے لیے اسٹاك رہا۔ اس لیے... بطورِ تقسیم کنندہ' ہمارا نام اس کتاب پر تھا۔[۳۷]

محمد عبداللہ قریشی نے بھی اس واقعے کی تفصیل بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اس کتاب میں مولوی صاحب نے اقبال کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے ان کی تمام ابتدائی نظمیں اور غزلیں، جو انھوں نے از راہِ خلوص ومحبت جمع کررکھی تھیں، شائع کردی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح یہ منتشر کلام جمع ہوکر دستبردِ حوادث سے محفوظ ہوجائے گا اور اقبال خوش ہوں گے۔ کیونکہ اس وقت تك ان کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا اور اُن کی شاعری پر بھی کوئی مستند کتاب اردو زبان میں نہیں لکھی گئی تھی۔ مگر مولوی صاحب کا خیال غلط نکلا۔انھیں مایوسی ہوئی، کیونکہ جب یہ کتاب چھپ کر اقبال کے پاس پہنچی اور **شیخ گلاب دین** نے اس کے متعلق **اقبال** کی رائے دریافت کی تو **اقبال** نے مذاق ہی مذاق میں کہہ دیا کہ میں تو نظر ثانی کے بعد اپنے کلام کا مجموعہ ابھی مرتب ہی کررہا تھا کہ مولوی صاحب نے 'اقبال' کو بیچنا بھی شروع کردیا۔ کم از کم وہ میری کتاب کا انتظار کرلیتے۔ مولوی صاحب نے جب یہ بات سنی تو اس کا

کچھ اور ھی مطلب لیا۔ **اقبال** کا کلام چھاپ کر **اقبال** کو نقصان پھنچانا اور جو اشعار اُس کے معیار سے گرچکے تھے انھیں محفوظ کرکے **اقبال** کی شھرت کو بٹّا لگانا، مولوی صاحب کا مقصد نہ تھا۔ انھوں نے کتاب کی تمام جلدیں اپنے مکان کے صحن میں ڈھیر کرکے ان کو آگ لگادی۔ خود کرسی بچھا کر ایك طرف بیٹھ گئے اور جب تك کتاب کا ایك ایك ورق جل کر راکھ نہ ھوگیا وھاں سے نہ ھلے اور گھر پھونك تماشا دیکھتے رھے۔ **اقبال** کو اس واقعے کا علم ھوا تو انھوں نے بڑا افسوس ظاھر کیا۔ چنانچہ 'بانگِ درا'، کی اشاعت کے دو سال بعد ۱۹۲۶ء میں یہ کتاب ازسرِ نو لکھ کر دوبارہ شائع کی گئی اور اِس دفعہ کلام کا بھت سا حصہ حذف کردیا گیا۔ صرف منتخب اشعار پر اکتفا کیا گیا۔[۳۸]

مذکورہ بالا بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ **اقبال** نے **احمد دین** کی کتاب کی طباعت کو اس وجہ سے ناپسند کیا تھا کہ اس زمانے میں 'بانگِ درا' کی طباعت کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ 'اقبال' میں **اقبال** کے کلام کا خاصا بڑا حصہ شامل کرلیا گیا تھا۔ اس وجہ سے اس کتاب کی حیثیت بھی ایک مجموعۂ کلام کی سی تھی۔ **اقبال** کی شکایت بے جا نہ تھی۔ **احمد دین** کی کتاب کی اشاعت سے 'بانگِ درا' کی اشاعت متاثر ہوسکتی تھی۔ دوسری طرف **احمد دین** کا اپنی کتاب کو جلا دینا ایک اضطراری فعل ضرور تھا، لیکن کوئی غلط اقدام نہ تھا۔ **اقبال** اپنے کلام کی اشاعت کے سلسلے میں بڑے حسّاس تھے، اپنے زیرِ ترتیب مجموعۂ کلام کے حوالے سے اس کتاب کو ناپسند کرنے کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ **احمد دین** اس کتاب سے مالی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ یقیناً اسی خیال کے پیشِ نظر **احمد دین** نے اپنی کتاب جلائی ہوگی تاکہ **اقبال** پر یہ واضح

ہو سکے کہ اس قسم کا کوئی مقصد ان کے سامنے نہ تھا۔

اس معاملے کا ایک پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ **اقبال** اور **احمد دین** کے بے انتہا گہرے تعلقات کے پیشِ نظر یہ ممکن نہیں کہ **اقبال** کو **احمد دین** کی کتاب کی طباعت کا پہلے سے علم نہ ہو۔ کوئی تعجب نہیں کہ انھوں نے اس سلسلے میں **اقبال** سے مشورہ بھی کیا ہو۔ دوسری طرف یہ بھی ممکن نہیں کہ **احمد دین** کو یہ علم نہ ہو کہ جلد ہی **اقبال** کے **اردو** کلام کا مجموعہ شائع ہونے والا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبال، طبعِ اول میں **اقبال** کا خاصا کلام تبصرہ و تنقید کے تحت مثالوں کی صورت میں درج کیا گیا ہے۔ نیز چند غزلیں اور مزاحیہ نظمیں بغیر کسی تمہید کے دو مختلف ابواب کی صورت میں کتاب میں شامل کی گئی ہیں۔ تاہم **احمد دین** کا مقصد اقبال کا مجموعہ کلام مرتب کرنا نہیں تھا، بلکہ **اقبال** کے فکر و فن پر لکھتے ہوئے اس کی شاعری کے بہترین نمونے پیش کرنا تھا۔ دوسری اور اہم بات یہ ہے کہ **احمد دین** کو تو **اقبال** نے ان لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کے لیے مامور کر رکھا تھا جو بلا اجازت **اقبال** کا کلام شائع کرتے تھے، ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ **احمد دین** خود اس جرم کا ارتکاب کرتے جس کے سدّ باب کے لیے انھیں مامور کیا گیا تھا۔ ان امور پر غور کرنے سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ **اقبال** کو یہ اندازہ نہ تھا کہ **احمد دین** اپنی کتاب میں اس کثرت سے ان کا کلام درج کریں گے اور **احمد دین** کو یہ خیال نہ تھا کہ **اقبال** ان کے تنقیدی طریقِ کار کو ناپسند کریں گے۔

احمد دین کے فرزند **خواجہ ریاض احمد** نے اس سلسلے میں قدرے مختلف واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ راقم الحروف کے نام اپنے خط مورخہ: ۲۷/اپریل ۱۹۶۶ء میں لکھتے ہیں:

> شیخ گلاب دین مرحوم جو والد صاحب کے دوست بھی تھے اور علامہ اقبال کے بھی، انھوں نے والد صاحب کو بتایا کہ یہ کتاب اقبال، کھیں بانگِ درا، پر جو (شائع ہونے والی تھی) اثر انداز نہ ہو۔ والد صاحب نے یہ سنا تو انھوں نے شیخ گلاب دین صاحب سے کہا کہ ان کا مقصد... کتاب لکھنے کا یہ ہرگز نہیں کہ اقبال

کو کسی قسم کا نقصان ہو۔ اس لیے انھوں نے اس
کتاب کو صحن میں رکھ کر بالکل جلا دیا۔

اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ **اقبال** نے کتاب پر اعتراض نہیں کیا تھا، بلکہ **شیخ گلاب دین** کے سمجھانے پر کتاب نذرِ آتش کی گئی تھی۔ یہ بیان چونکہ **احمد دین** کو بے حد قریب سے جاننے والے شخص کا ہے، اس لیے اسے کلی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم **شیخ مبارک علی** کے مذکورہ بالا بیان پر کسی اور کے بیان کو ترجیح نہیں دی جا سکتی کیوں کہ وہ **اقبال** اور **احمد دین** دونوں کو بہت قریب سے جانتے تھے۔

حواشی

۱۔ تاریخ اقوام کشمیر [جلد: دوم] (لاہور) ۱۹۳۴ء، ص: ۲۸۴

۲۔ ماہنامہ مخزن (لاہور) جلد: ۱، شمارہ: ۱، اپریل ۱۹۰۱ء، ص: ۸

۳۔ اس پریس کا نام کہیں تو یہی لکھا ہے اور کہیں 'مطبع خادم التعلیم' زیرِ نظر مقالے میں یہ نام دونوں طرح لکھا گیا ہے، **احمد دین** کی جو کتابیں اس پریس میں چھپی ہیں، ان پر یہ نام دونوں طرح ملتا ہے، جس کتاب پر نام کی جو صورت ملتی ہے، اس کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے وہی درج کی گئی ہے۔

۵۔ مکتوب، بنام راقم الحروف، مورخہ: ۷ر فروری ۱۹۶۶ء

۶۔ یہ مقالہ لکھا جا چکا تھا کہ **محمد حنیف شاہد** کی کتاب اقبال اور انجمن حمایتِ اسلام، نظر سے گزری۔ (اس پر تاریخِ طباعت جولائی ۱۹۷۶ء درج ہے لیکن یہ اس کے کوئی سال بھر بعد منظرِ عام پر آئی) **احمد دین** اور انجمن حمایتِ اسلام کے تعلق سے اس کتاب میں مندرجہ ذیل اہم معلومات ملتی ہیں:

الف۔ ۲۴ر ستمبر ۱۸۸۴ء کو انجمن حمایتِ اسلام کے قیام کے لیے **مسجد بکن خاں** (اندرون موچی دروازہ) لاہور میں ہم خیال مسلمانوں کا جو جلسہ منعقد ہوا تھا، اس میں **احمد دین** نے بھی شرکت کی تھی۔ (ص: ۲۵) وہ انجمن کے بانیوں میں سے تھے۔

ب۔ ۲۲ر مارچ ۱۹۱۳ء کو انجمن کے اٹھائیسویں سالانہ اجلاس میں **علامہ اقبال** نے اپنا کلام سنانے سے پہلے فرمایا تھا:

میں اس سال علالتِ طبع کی وجہ سے کوئی نظم
نہیں لکھ سکا۔ مولوی احمد دین صاحب بی اے، جو
میرے دوست ہیں، مجھے اس وقت گھر سے اٹھالائے

ھیں... (ص:۸۵)

ج۔ ۸؍جولائی ۱۹۲۳ء کو انجمن کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا، جس میں **علامہ اقبال** نے شرکت کی۔ **احمد دین** کی تجویز پر **علامہ اقبال** کو بالاتفاق انجمن کا آنریری جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ (ص ۱۰۸-۱۰۷)

د۔ ۲۲؍اپریل ۱۹۰۰ء کو **علامہ اقبال** کے ساتھ **احمد دین** بھی انجمن کی میموریل کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے (ص:۱۷۴)

ہ۔ ۱۰؍جنوری ۱۹۱۶ء کو **علامہ اقبال** کے ساتھ **احمد دین** بھی 'سب کمیٹی سالانہ اجلاس کے رکن منتخب ہوئے۔ (ص:۱۷۶)

و۔ انجمن نے ۱۱؍نومبر ۱۹۱۷ء کو ایک دینی مدرسہ قائم کرنے کے لیے ایک ہشت رکنی سب کمیٹی مقرر کی۔ **علامہ اقبال** اور **احمد دین** اس کے رکن تھے۔ (ص:۱۷۶)

ز۔ انجمن نے اپنے مدارس کے انتظامات کے لیے ایک ہفت رکنی سب کمیٹی ۱۹؍فروری ۱۹۲۲ء کو مقرر کی۔ **علامہ اقبال** اور **احمد دین** اس کے رکن تھے۔ (ص:۱۷۷)

ح۔ جولائی ۱۹۲۲ء میں **علامہ اقبال** نے علالت کی وجہ سے انجمن کی معتمدی سے استعفیٰ دیا تو **احمد دین** بعض دوسرے ارکان کے ساتھ **علامہ اقبال** کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کی۔ (ص:۱۷۸)

ط۔ ۲۳؍جولائی ۱۹۲۳ء کو انجمن نے کالج کمیٹی اور جلسہ کمیٹی کے نام سے دو سب کمیٹیاں مقرر کیں۔ **علامہ اقبال** اور **احمد دین** ان دونوں کے رکن تھے۔ (ص:۱۷۸)

ی۔ یکم دسمبر ۱۹۰۱ء کو انجمن کی جنرل کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں رائے شماری کے ذریعے مختلف عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ انسپکٹر اسلامیہ کالج کے عہدے کے دو امیدوار تھے، **علامہ اقبال** اور **احمد دین**۔ دونوں کو بالترتیب تیس اور ایک سو گیارہ ووٹ ملے۔ **احمد دین** اس عہدے پر منتخب ہو گئے۔ (ص:۱۸۳-۱۸۲)

ک۔ **احمد دین** نے انجمن کی جنرل کونسل کے اجلاس منعقدہ ۱۵؍فروری ۱۹۰۲ء، ۲؍مارچ ۱۹۱۳ء کی صدارت کی۔ **علامہ اقبال** نے ان دونوں اجلاسوں میں شرکت کی تھی۔ (ص:۱۸۵-۱۸۴)

۷۔ راقم الحروف نے اس مضمون کو انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) کے جریدے ماہنامہ قومی زبان' بابت ستمبر ۱۹۶۶ میں دوبارہ شائع کرادیا تھا۔

۸۔ ذکرِ اقبال' بزم اقبال (لاھور) ۱۹۵۵ء، ص:۸۰-۷۹

۹۔ حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں، سہ ماہی اقبال (لاھور) اپریل ۱۹۵۶ء

۱۰۔ ڈاکٹر **رفیع الدین ہاشمی** اپنے ایک مکتوب (مورخہ:۱۶؍رمضان ۱۴۰۳ھ بنام راقم الحروف) میں لکھتے ہیں:

...افضل حق قرشی نے رسالہ مجلس کشمیری

مسلمانانِ لاہور (جلد: ۱، شمارہ: ۱) کے حوالے سے مولوی احمد دین مرحوم کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ مجلس کے جائنٹ سیکرٹری منتخب ہوئے۔ نیز رسالے کی نگرانی کے لیے مقررہ سب کمیٹی کے بھی رکن تھے (اقبال ریویو، جنوری ۱۹۸۳ء) انھی دنوں مجھے قرشی صاحب کے ہاں مذکورہ رسالہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے اس خیال سے رسالے پر نظر دوڑائی کہ ممکن ہے مولوی صاحب مرحوم کے بارے میں مزید کوئی بات مل جائے، چنانچہ ایک بات معلوم ہوئی۔ رسالے کے آخر میں ضمیمہ: ۲ میں مجلس قواعد (اغراض ومقاصد، قواعد، عہدہ دارانِ مجلس، فرائضِ عہدہ داران، مجلسِ عام، اختیاراتِ مجلسِ عام، قواعد کمیٹی منتظم) میں 'عہدہ دارانِ مجلس' کے تحت درج ہے کہ عہدہ داران ہر تیسرے سال ممبرانِ مجلس میں سے جلسۂ عام کے ذریعے منتخب کیے جائیں گے اور یہ عہدے سب آنریری ہوں گے۔ عہدہ داروں کی تفصیل میں بتایا گیا ہے کہ 'جائنٹ سیکرٹری ایک مقامی...

آگے چل کر 'فرائضِ عہدہ داران' کے تحت قواعد کی شق:۹ میں یہ درج ہے: جائنٹ سیکرٹری باہر سے آئے ہوئے خطوط کا جواب دے گا اور حسبِ قرار دادِ مجلس اصحابِ بیرون جات سے خط کتابت اپنے دستخط سے کرے گا۔ (ص:۲۱)

رپورٹ کے آخر میں ۲۰/ جون ۱۸۹۶ء کی تاریخ درج ہے۔

۱۱۔ 'لاہور کا چیلسی' [مقالہ]: **حکیم احمد شجاع**، رسالہ نقوش (لاہور) جنوری ۱۹۶۶ء، ص:۳۱

۱۲۔ 'لاہور کا چیلسی' [مقالہ] محولہ بالا، ص:۱۶

۱۳۔ اقبال — **احمد دین** (لاہور) ۱۹۲۶ء، ص:۱

۱۴۔ اقبال — **احمد دین** محولہ بالا، ص:۲

۱۵۔ 'لاہور کا چیلسی' [مقالہ] محولہ بالا، ص:۳۱

۱۶۔ بحوالہ مکتوب **محمد عبداللہ قریشی**، مورخہ:۲۴/نومبر ۶۶ء بنام راقم الحروف۔

۱۷۔ **مولوی محبوب عالم** جب یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے تھے تو اُن کے احباب نے ۲۵/مئی ۱۹۰۰ء کو ایک الوداعی جلسہ منعقد کیا تھا۔ اس جلسے کی روداد نوشتہ **سر شیخ عبدالقادر** پیسہ اخبار (لاہور) کے ۲/جون ۱۹۰۰ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی جسے بعد میں **مولوی محبوب عالم** نے اپنے سفر نامہ یورپ میں شامل کیا تھا۔ (طبع دوم [لاہور] ۱۹۳۳ء، ص:۱۸-۸) اس روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ جن احباب نے یہ جلسہ منعقد کیا تھا، ان میں **احمد دین** بھی شامل تھے۔

۱۸۔ آئینہ صدق وصفا — **مرزا مسعود بیگ** (لاہور) ۱۹۶۴ء، ص:۱۶-۱۵

۱۹۔ روزگارِ فقیر — **فقیر وحید الدین** [جلد:اول] (کراچی) ۱۹۶۴ء، ص:۲۷

۲۰۔ یہ سطور جب لکھی گئی تھیں تو **مولانا غلام رسول مہر** اور **حکیم احمد شجاع** بقیدِ حیات تھے۔

۲۱۔ **مولانا عبدالمجید سالک** لکھتے ہیں کہ ان محفلوں میں:

> مولوی احمد دین... سے (اقبال کے) روابط روز افزوں ہوئے... راقم الحروف نے بھی متعدد بار علامہ اور مولوی احمد دین سے اُس چبوترے (حکیم امین الدین کے مکان کے سامنے کا چبوترہ) پر ملاقات کی۔ (ذکرِ اقبال (لاہور) ۱۹۵۵ء، ص:۲۶)

۲۲۔ ملفوظات اقبال / مرتبہ: **محمود نظامی**، دوسرا ایڈیشن [لاہور] ۱۹۴۹ء، ص:۱۰۸

۲۳۔ ایضاً، ص:۱۳۳

۲۴۔ ذکرِ اقبال، محولہ بالا، ص:۶۹-۶۸

۲۵۔ اقبال اور کشمیر [مقالہ] **محمد عبداللہ قریشی**، سہ ماہی اقبال (لاہور) شمارہ:۱، اکتوبر ۱۹۵۶ء، ص:۲۹

۲۶۔ انوارِ اقبال / مرتبہ: **بشیر احمد ڈار** (کراچی) ۱۹۶۷ء، ص:۱۶۰

۲۷۔ رسالہ نقوش (لاہور) مکاتیب نمبر، جلد: اول ۱۹۵۷ء، ص: ۲۹۲

۲۸۔ یہ خط ہفتہ وار ہماری زبان (علی گڑھ) کے ۸/مئی ۱۹۶۳ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ اصل خط **محمد عبداللہ قریشی** صاحب کی نظر سے گزرا ہے، انھوں نے اس کی ایک نقل راقم الحروف کو بھیجی تھی۔ ہماری زبان ' کے مطبوعہ متن میں بعض الفاظ غلط درج ہوئے ہیں'، اس لیے یہاں **محمد عبداللہ قریشی** کا ارسال کردہ متن درج کیا گیا ہے۔

۲۹۔ **خواجہ فیروزالدین** (لاہور) کے مشہور بیرسٹر اور **اقبال** کے گہرے دوست تھے۔ وہ **اقبال** کے ہم زلف [والدۂ **آفتاب اقبال** کے تعلق سے] بھی تھے۔ برصغیر پاک وھند کے ممتاز موسیقار **خورشید انور** انہی کے صاحبزادے ہیں۔

۳۰۔ مکتوب بنام راقم الحروف مورخہ: ۷/فروری ۱۹۶۶ء

۳۱۔ مکتوب بنام راقم الحروف مورخہ: ۱۳/مارچ ۱۹۶۶ء

۳۲۔ طبع اول کے دو نسخے جو آتش سے بچ گئے۔ راقم الحروف کی نظر سے گزرے ہیں۔ ان دونوں پر سالِ طباعت درج نہیں۔ ان دونوں نسخوں پر اندرونی سرورق بھی نہیں ہیں جن پر مصنف اور کتاب کا نام ہوتا ہے۔ کوئی دیباچہ بھی نہیں۔ سالِ تصنیف کے تعین کے سلسلے میں کتاب کے متن میں ایک اشارہ ملتا ہے۔ ص: ۳۲۵ پر 'پیامِ اقبال طلبۂ علی گڑھ کے نام کا سالِ تصنیف ۱۹۰۷ء درج کر کے اگلے صفحے پر لکھا ہے:

مشورہ اب سولہ سال بعد بھی مسلمانانِ ھند کے لیے

قابلِ غور ھے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۹۲۳ء میں لکھی گئی تھی۔ گمانِ غالب ہے کہ یہی سالِ طباعت بھی ہے۔ اگر کتاب ۱۹۲۳ء کے بعد طبع ہوئی ہوتی تو مصنف مذکورہ جملے میں مناسب تبدیلی ضرور کر دیتے۔ یہ کتاب انھوں نے خود طبع کرائی تھی، کسی ناشر کو نہیں دی تھی، اس لیے وہ اس کے متن میں بآسانی تبدیلی کر سکتے تھے۔

۳۳۔ **مولانا مہر** کا یہ تاثر کسی غلط فہمی پر مبنی ہے ممکن ہے انھوں نے کتاب کی طبع دوم ہی کو 'اصل کاپی' سمجھا ہو ورنہ طبعِ اول میں خارج شدہ کلام کا خاصا بڑا حصہ شامل ہے۔

۳۴۔ مکتوب بنام راقم الحروف مورخہ: ۱۳/مارچ ۱۹۶۶ء۔

۳۵۔ یہ درست نہیں۔ اس معاملے میں **شیخ مبارک علی** کا بیان اسی مقالے میں موجود ہے۔

۳۶۔ 'لاھور کا چیلسی' [مقالہ] محولہ بالا، ص: ۲۸

۳۷۔ مکتوب **احمد علی شیخ** منجانب **شیخ مبارک علی** بنام راقم الحروف مورخہ: ۲۸/فروری ۱۹۶۶ء

۳۸۔ حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں [مقالہ] محولہ بالا، ص: ۴۶-۴۴

تہذیبِ نسواں :ایک محاکمہ

چودھری محمد نعیم

یہ مفروضہ کہ کوئی تحریر خاص عورتوں کے لیے ہوسکتی ہے، **اردو** خواں لوگوں میں ۱۸۶۸ء سے پہلے نہیں تھا۔ ہماری روایت یہ تھی کہ کسی بھی کتاب کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے جو لسانی اور ذہنی صلاحیت درکار ہو، وہ اگر کسی میں موجود ہے، خواہ عورت ہو یا مرد، تو اس کتاب کے صفحے اس کے لیے کھلے ہوتے تھے۔ **نذیر احمد** کے ناول 'توبۃ النصوح' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

نصوح: کیا تم کو اپنا گلستاں پڑھنا یاد نہیں؟

فہمیدہ: یاد کیوں نہیں۔ جس دن حمیدہ کا دودھ چھڑایا ہے، اس کے اگلے دن میں نے 'گلستاں' شروع کی تھی۔

نصوح: بھلا تم کو یہ بھی یاد ہے کہ میں تمھارے سبق سے آگے آگے جا بجا سطروں کی سطروں پر سیاہی پھیر دیا کرتا تھا، بلکہ بعض دفعہ

صفحے کے صفحے ایسے آپڑے کہ مجھ کو اوپر سے سادہ کاغذ لگاکر ان کو چھپانے کی ضرورت ہوئی۔

فہمیدہ: خوب اچھی طرح یاد ہے۔ چوتھائی کتاب سے کم تو نہ کٹی ہوگی۔

نصوح: تم پڑھتی تھیں، تب چوتھائی بھی کٹی۔ اگر کوئی دوسری عورت پڑھتی ہوتی تو میں آدھی کی خبر لیتا۔ وہ تمام بیہودہ باتیں تھیں جن کو میں کاٹتا اور چھپاتا پھرتا تھا۔

فہمیدہ: سچ کہو۔ میں تو سمجھی مشکل جان کر چھڑوادیتے ہیں۔[1]

نذیر احمد ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ اگر **نصوح** اپنی بیوی **فہمیدہ** کے بجائے اپنے بیٹے **سلیم** کو 'گلستاں' پڑھاتا تو کیا کرتا، لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ **فارسی** سکھانے کے لیے دونوں کو پہلا سبق 'گلستانِ سعدی' سے ہی ملتا کہ صدیوں سے یہی ہماری روایت بن چکی تھی۔ اس روایت میں خلل ۱۸۶۸ء میں آیا جب صوبہ جات شمال مغرب کی حکومت نے اپنے گزٹ نمبر ۹۱ے (الف) مجریہ ۲۰/اگست ۱۸۶۸ء کے ذریعہ **اردو** اور **ہندی** کے ادیبوں کو دعوت دی کہ وہ ادبیات اور سائنس کے کسی بھی پہلو سے متعلق مفید کتابیں لکھ کر سرکار کو بھیجیں، بالخصوص ایسی کتابیں جو ہندوستان کی عورتوں کے لیے مناسب ہوں۔ سرکار نے ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیا کہ بہترین کتابوں کے مصنفوں کو انعام دیا جائے گا اور ان کی ان مخصوص تصانیف کی اشاعت میں مدد بھی دی جائے گی۔ **نذیر احمد** کے تینوں ناول مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) بنات النعش (۱۸۷۲ء) اور توبۃ النصوح (۱۸۸۴ء) اسی اعلان کے تحت لکھے گئے تھے اور انھیں انعام بھی ملا تھا۔[2]

حکومت کا یہ اعلان کتنا اہم تھا اور اس کے نتائج کتنے دوررس تھے، اس کا اندازہ **الطاف حسین حالی** کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے:

> اس اشتہار کا اثر اس تمام گروہ میں جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لیاقت رکھتا تھا مگر اس لیاقت کو کام میں لانا نہیں جانتا تھا، برقی قوت کی طرح دوڑ گیا... اردو

لٹریچر صرف اسی تحریک کی بدولت جو کہ
اشتہار مذکور نے ملک میں عموماً پیدا کردی تھی،
تھوڑے عرصے میں توقع سے بہت زیادہ ترقی
کرگیا۔ [۳۳]

حالی کی مجالس النساء اور **سید احمد دہلوی** کی ہادی النساء 'اسی اشتہار کا ثمرہ سمجھی جاسکتی ہیں۔ بڑی بات یہ تھی کہ اب یہ خیال **اردو** خواں لوگوں میں عام ہوگیا کہ ان کی خواتین (اوران کی کم عمر اولاد) کے لیے الگ اور کسی نوعیت (زبان، مقصدیت، موضوعات) سے مخصوص کردہ ادب نہ صرف تیار کیا جاسکتا ہے بلکہ اس کی ضرورت بھی ہے۔ یہی زمانہ تھا جب **اردو** میں طرح طرح کے رسائل بھی شائع ہونے لگے تھے جو اُن روزانہ یا ہفتہ وار اخبارات سے جدا تھے، جن میں محض سیاسی یا سماجی نوعیت کی ملکی اور بیرونی خبریں ہوتی تھیں۔ چنانچہ یہ لازم تھا کہ بعض لوگوں کو یہ خیال بھی آئے کہ اگر خواتین کے لیے خصوصی نوعیت کی کتابیں مقبول ہوسکتی ہیں تو خواتین کے لیے مخصوص رسائل بھی نکالے جاسکتے ہیں۔

اردو میں خواتین کے لیے مخصوص اولین جریدہ کون سا تھا، یہ ابھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اس موضوع پر سب سے سیر حاصل بحث ڈاکٹر **نسیم آرا** کے مضمون 'خواتین کے اخبارات ورسائل: پہلا تاریخی وتحقیقی جائزہ 'میں ملتی ہے۔[۳۴] اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ **سررشتۂ تعلیم اور مدارس دختران** کے واسطے مفید مضامین کی اشاعت کا سلسلہ اس گزٹ کے فوراً بعد ہی شروع ہوا تھا اور ممکن ہے کہ سب سے پہلے یہ قدم آگرہ کے مفیدِ عام 'اخبار نے اٹھایا ہو، جو مہینے میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر **منشی احمد خاں صوفی** تھے۔ لیکن یہ رسالہ ایک عام نوعیت کا ہی تھا اور خواتین کے مسائل کی تخصیص اس کی شناخت نہ تھی۔ یہی صورت **مولوی محبّ حسین** کے جریدہ معلم ' کی بھی کہی جاسکتی ہے جو غالباً ۱۸۸۷ء میں شائع ہونا شروع ہوا تھا اور ۱۹۰۱ء تک جاری رہا۔ یہ بھی محض ایک عام علمی رسالہ تھا، البتہ یہ ضرور ہے کہ اس میں طبقۂ نسواں کے مسائل سے متعلق مضامین نمایاں تعداد میں شائع ہوتے تھے۔ کیا یہ صورت ابتدا سے ہی تھی؟ یہ ابھی طے نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بعد کے دستیاب شماروں میں خواتین کے مسائل کے متعلق مضامین اور منظومات نمایاں طور پر ملتی ہیں۔ ڈاکٹر نسیم

آرا کی تحقیق کے مطابق **مولوی محبّ حسین** نے معلم ' ہی کو ۱۸۹۴ء میں معلمِ نسواں ' کا نام دے دیا تھا۔ اس نام سے یہ رسالہ ۱۹۰۱ء تک نکلتا رہا۔ اس رسالے کے سرورق پر یہ عبارت درج ہوتی تھی: "اس رسالے کی غایت ترقی تعلیمِ نسواں ھے اور اس میں فقط عورتوں ھی کی حالت سے بحث کی جاتی ھے"۔ اس کے بند ہونے کا سبب **مولوی صاحب** کا ایک مضمون تھا جس میں انھوں نے پردے کی سخت مخالفت کی تھی اور جس کے خلاف عوام میں اشتعال پھیل گیا تھا۔[۵]

معلم ' کے اجرا کے چار سال بعد اور اس کے معلمِ نسواں ' بننے سے دس سال پہلے، یعنی ۱۸۸۴ء میں لکھنؤ سے ایک رسالہ رفیقِ نسواں ' کے نام سے جاری ہوا، جو مہینے میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ اس کا ناشر ایک عیسائی مشن، میتھوڈسٹ ایپس کوپل چرچ تھا۔ اس کی کچھ خصوصیات بھی تھیں۔ یہ ایک 'پرچہ قومِ عیسائیان' تھا اور مخصوص 'عیسائی عورتوں' کے لیے شائع ہوتا تھا۔ ۶ ورق کا یہ رسالہ غربا کو مفت اور دیگر شائقین کو ایک پیسہ فی پرچہ علاوہ محصول ڈاک کی ادائیگی پر مہیا تھا۔ اس رسالے کی بانی مبانی مس **ایزا ایلا تھوبرن** (۱۹۴۰ء) تھیں، جو تیس سال کی عمر میں امریکہ کے ایک غیر معروف قصبہ سے آ کر یہیں کی ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے چرچ کی تعلیمی تحریک سے منسلک تھیں اور ان کا قائم کردہ اسکول اب انہی کے نام سے I.T. Collge پکارا جاتا ہے اور اب بھی اپنا اعلیٰ معیار برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ان کے بھائی J.M.Thoburn ان سے پہلے لکھنؤ آ گئے تھے اور ایک وقت میں وہاں کے **بشپ** بھی رہے تھے۔ **بشپ تھوبرن** نے اپنی بہن کی سوانح لکھی ہے جس میں اس رسالے کے بارے میں بھی کچھ معلومات شامل ہیں۔[۶] وہ اپنی بہن کی ایک مطبوعہ تقریر کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ اس نوعیت کا رسالہ نکالنے کی تجویز ایک امریکن خاتون نے پیش کی تھی جو ہندوستان کی سیر کرتے ہوئے لکھنؤ بھی آئی تھیں اور انھوں نے اس کام کے لیے پانچ ہزار ڈالر بھی دیے تھے۔ (یہ رقم آج کے ڈیڑھ لاکھ ڈالر سے بھی کچھ زیادہ قرار پائے گی (تب میتھوڈسٹ ایپس کوپل چرچ کی خواتین نے چندہ کر کے بیس ہزار ڈالر مزید جمع کر کے پچیس ہزار ڈالر کا ایک ٹرسٹ قائم کر دیا اور اس سے سب سے پہلے **اردو** میں رفیقِ نسواں ' نکالنا شروع کیا۔ چنانچہ پہلا شمارہ ۵/مارچ ۱۸۸۴ء کو شائع ہوا۔ اسے ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اسی نوعیت کے رسالے **ھندی، بنگالی** اور **تامل** میں بھی شائع کیے جانے لگے۔ اس کی ایڈیٹر **مس تھوبرن** اور منیجر **مسز بیڈلی** تھیں۔ یہ

دونوں خواتین **اردو** میں مہارت نہیں رکھتی تھیں، چنانچہ ان کے نام سے جو تحریریں رسالے میں شائع ہوئیں، انھیں ترجمہ ہی سمجھنا چاہیے جو ادارے میں ملازم منشی کرتے تھے، لیکن مضامین کے انتخاب کو **مس تھوبرن** کی ذمہ داری سمجھنا بجا ہوگا۔ **مسز بیڈلی** غالباً ان کے بھتیجے کی بیوی تھیں اور وہ اور ان کے شوہر دونوں چرچ سے ہی منسلک تھے) یہ اخبار بالتصویر تھا۔ میں ابھی تک اس کا کوئی شمارہ خود نہیں دیکھ پایا ہوں۔ ڈاکٹر **نسیم آرا** کے مطابق اس میں تمام مضامین اصلاحی اور معلوماتی ہوتے تھے اور شاعری اور فکشن شاذ و نادر۔ **محمدی بیگم** اور **ممتاز علی** دونوں اس اخبار کے قاری تھے اور 'تھذیبِ نسواں' اور 'مشیر مادر' میں اس سے حاصل کیے ہوئے مضامین بھی شائع کیے جاتے تھے۔ ایک موقع پر **مس تھوبرن** کچھ ماہ کے لیے واپس امریکہ گئی تھیں اور وہاں سے اپنے رسالے کو ایک خط امریکہ کے ایک کسان گھرانے کے بارے میں لکھا تھا، جو بہت ممکن ہے خود ان کے رشتہ داروں کے بارے میں رہا ہو۔ یہ خط 'تھذیبِ نسواں' میں نقل ہوا تھا اور کچھ دنوں بعد **محمدی بیگم** نے رشک بھرے لہجے میں اس چندے کا بھی ذکر کیا تھا جو **مس تھوبرن** اپنے تعلیمی مقاصد کے لیے امریکہ میں تمام خواتین سے جمع کر سکی تھی۔ یہاں یہ ذکر بھی شاید نامناسب نہ ہو کہ مشہور ادیب **مرزا محمد ہادی** (**مرزا رسوا**) ضرور رسالہ 'رفیقِ نسواں' کی ادارت میں کچھ نہ کچھ مدد دیتے رہے ہوں گے کیوں کہ وہ ایک عرصہ تک ان دونوں اداروں میں **فارسی** اور **اردو** پڑھاتے رہے جن کا تعلق میتھوڈسٹ ایپس کوپل چرچ سے تھا۔

'رفیقِ نسواں' کے اجرا کے چند ماہ بعد اگست ۱۸۸۴ء میں دھلی سے **سید احمد دہلوی** (۱۸۴۶-۱۹۱۸ء) نے 'اخبار النساء' جاری کیا جو مہینے میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ یہ غالباً پہلا رسالہ تھا جو بلا کسی تفریق کے تمام خواتین کے لیے مخصوص تھا اور جس میں **اردو** خواں خواتین کی تحریریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ **مولانا امداد صابری** کا بیان ہے کہ اس اخبار میں خانہ داری سے متعلق معلومات دی جاتی تھیں اور خاص طور پر ایسے مضامین شائع کیے جاتے تھے جن میں عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کی جاتی تھی اور بتایا جاتا تھا کہ وہ حیا اور شرافت کو نہ چھوڑیں اور خانگی جھگڑوں سے بچیں۔ اس اخبار میں عورتوں کے مضامین بھی ہوتے تھے۔[۷] **سید احمد دہلوی** نے اپنی مشہورِ زمانہ لغت 'فرہنگِ آصفیہ' (جلد: اول) میں 'ارمغانِ دھلی' کے تحت حاشیے پر درج کیا کہ 'اخبار النساء' ۱۸۸۴ء میں سب سے

پہلے بیگماتی زبان میں شائع ہوا، اور دو برس بعد مالک کی تبدیلی ہو جانے سے ملتوی کر دیا گیا۔ مجھے افسوس ہے کہ اب تک اس رسالے کے کسی شمارے تک میری رسائی نہیں ہو سکی۔ **سید صاحب** کا یہ قول کہ یہ رسالہ **بیگماتی زبان** میں شائع ہوتا تھا، مزید تجسس پیدا کرتا ہے۔

اخبار النساء ' ۱۸۸۶ء میں بند ہو گیا۔ اس کے بعد کئی سال تک کسی ایسے نئے رسالے کا نشان نہیں ملتا جو خواتین کے لیے مخصوص رہا ہو۔ حیرت ہوتی ہے کہ پٹنہ، لکھنؤ، آگرہ اور دھلی جیسے بڑے شہروں اور **اردو** طباعت و اشاعت کے مرکزوں میں لوگوں کا خیال اس طرف نہیں گیا، البتہ حیدر آباد سے معلم ' اور لکھنؤ سے رفیقِ نسواں ' اپنے اپنے محدود حلقوں میں جاری رہے۔ بالآخر **اردو** طباعت کے سب سے بڑے مرکز یعنی لاہور میں اس وقت کے سب سے معروف پبلشر کا دھیان اس طرف گیا اور **منشی محبوب عالم** (۱۹۳۳-۱۸۶۳ء) نے ۱۸۹۳ء میں ایک ماہانہ رسالہ شریف بیٹیاں ' جاری کر دیا۔

اردو پریس کی تاریخ میں **منشی محبوب عالم** کا نام اتنا ہی اہم ماننا چاہیے جتنا **منشی نول کشور** کا نام کہا جاتا ہے۔ **منشی محبوب عالم** تجارت کے رموز سے پوری طرح واقف تھے اور طرح طرح کے تجربات سے **اردو** قارئین کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔ آپ کا سب سے مشہور کارنامہ پیسہ اخبار ' تھا جو انگلینڈ کے پینی جرنلز ' کے نمونے پر ۱۸۸۷ء میں گوجرانوالہ سے نکلنا شروع ہوا، لیکن بڑھتی مقبولیت کی وجہ سے **منشی صاحب** اسے اور اپنے مطبع کو جلد ہی لاہور لے آئے۔ یہ ایک ہفتہ وار اخبار تھا اور ہر شمارے کی قیمت محض ایک پیسہ ہوتی تھی۔ ان کے مطبع کا نام مطبع خادم التعلیم تھا اور اس کی طرف سے ہر طرح کے موضوعات پر تصانیف، تالیفات اور تراجم شائع کیے جاتے تھے۔ **منشی صاحب** خود بھی تصنیف و تالیف میں درک رکھتے تھے اور بالخصوص تجارت اور صنعت سے متعلق انھوں نے بیسیوں کتابیں لکھ کر شائع کی تھیں۔ ۱۹۰۰ء میں انگلینڈ، فرانس، ترکی وغیرہ کے سفر کے بعد انھوں نے ایک طویل سفرنامہ شائع کیا تھا، جس سے ان کی گوناگوں دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ ان کی بصیرت اور جذبۂ تحقیق کا بھی پتہ چلتا ہے۔

شریف بیٹیاں ' ایک ماہنامہ تھا اور **منشی صاحب** ہی اس کے مدیر تھے۔ ڈاکٹر **نسیم آرا**، اس کے پہلے شمارے کے مطالعے کے بعد لکھتی ہیں کہ اس کے نام کی تختی کے نیچے یہ عبارت درج ہوتی تھی:

تعلیمِ نسواں کا ماھوار رساله جس میں سعادت
مند لائق بیٹی، سلیقه شعار نیك بخت بی بی اور
مهربان عقل مند ماں بننے کی هدایات درج هوتی
هیں۔

یہی عبارت ہمیں اس اشتہار میں ملتی ہے جو ان کے مطبع سے شائع شدہ ایک ناول 'چلتا پرزہ' (۱۸۹۴ء) میں چھپا تھا۔ اشتہار میں شامل مزید عبارت بھی ہمارے لیے اہم ہے:

غرض اس کی اشاعت سے صرف یه هے که
یوروپ اور امریکه کے اعلیٰ درجه کے فرقه اناث
کے رسالوں کی طرز پر هندوستانی شریف
بیبیوں میں امور خانه داری ، حسن معاشرتی
اور تربیت اطفال کا عمده مذاق پیدا کیا جاوے۔

بدقسمتی سے اس رسالے کو وہ مقبولیت نہ مل سکی جس کی ضرورت تھی اور اسے دو تین سال کے بعد بند ہو جانا پڑا۔ البتہ 'تھذیبِ نسواں' کے قائم ہو جانے کے بعد ۱۹۰۹ء میں **منشی صاحب** نے اسے دوبارہ 'شریف بی بی' کے نام سے اپنی بیٹی کی ادارت میں شائع کرنا شروع کیا۔ اس بار یہ عرصے تک نکلتا رہا بلکہ کچھ عرصے کے لیے اسی نام سے ہفتہ وار بھی شائع ہوا۔ **منشی صاحب** نے بچوں کے لیے بھی ایک اخبار جاری کیا تھا اور اس کا نام 'بچوں کا اخبار' رکھا تھا۔ یہ بھی کافی عرصے تک نکلتا رہا۔ اگرچہ اسے وہ مقبولیت نہ مل سکی جو **منشی ممتاز علی** کے 'پھول' کو ملی۔ یہ رسالہ بھی ماہانہ شائع ہوتا تھا اور باتصویر تھا۔

'تھذیبِ نسواں' کے اجرا سے قبل 'زمانہ' رسالوں کے تعلق سے جو صورتِ حالات تھی اس کا نقشہ **منشی ممتاز علی** نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح کھینچا ہے:

قبل اس کے که کوئی خاتون اپنی هم جنسوں کے
لیے 'زمانه' اخبار نکالے، بعض مردوں نے ایسے
اخبار نکالے تھے جس میں وہ مستورات کی

دلچسپی کے مضامین لکھتے تھے۔ اس قسم کا سب سے پہلا اخبار جاری کرنے کا سہرا ہمارے برادر معظم مولوی سید احمد صاحب مرحوم مصنف 'فرہنگِ آصفیہ' کے سر ہے جنھوں نے ۸۷ء(کذا) میں ایک اخبار دو ہفتہ وار 'اخبار النساء' کے نام سے شائع کرنا شروع کیا، مگر وہ نہ چلا۔ لوگوں نے اس پر **'اخباروں کی جورو'** کی پھبتی کہی اور ایسی ایسی باتیں کہیں کہ وہ برداشت نہ کرسکے اور انھیں بہت جلد اخبار بند کردینا پڑا۔ اس کے بعد 'پیسہ اخبار' کے منشی محبوب عالم صاحب ۹۳ء میں ایک رسالہ 'شریف بیبیاں' نکالا۔ اس پر بھی ویسی ہی پھبتیاں جڑی گئیں، تو وہ بھی تھوڑے عرصے کے بعد بند ہوگیا۔ آخر مرحومہ محمدی بیگم نے ۹۸ء میں ہفتہ وار اخبار نکالا جسے جاری ہوئے آج خدا کے فضل سے پورے بیس سال ہوئے۔ اس کے چند سال بعد جب لوگوں کی نظریں زنانہ اخبار سے مانوس ہوگئیں تو علی گڑھ سے 'خاتون' دھلی سے 'عصمت' آگرہ سے 'پردہ نشیں' لاہور سے 'شریف بی بی' بھوپال سے 'ظل السلطان' قادیان سے 'احمدی خاتون' جاری ہوئے۔[۸]

خاص 'تہذیبِ نسواں' کا ذکر کرنے سے پہلے دو باتیں ذہن میں تازہ کرلینا ضروری ہوگا۔ ۱۸۹۸ء میں تو خیر، بیسویں صدی کے ابتدائی دہوں میں بھی اعلیٰ اور امیر خاندانوں کے باہر شاذ ہی

ایسی عورتیں رہی ہوں گی جن کے ہاتھ میں یہ اختیار تھا کہ وہ کوئی رسالہ یا کتاب خرید لیں۔ رسالے کے لیے چندے کی رقم، اس کے بھیجنے کے لیے منی آرڈر سے لے کر ڈاک خانے جانا، رسالے کی وصولیابی، ان تمام باتوں کے لیے عورتیں اپنے والدوں، بھائیوں اور شوہروں کی دستِ نگر ہوتی تھیں۔ زنانہ رسالے کی خریداری بھی مردوں کی اجازت اور باقاعدہ مدد سے ہی کی جاسکتی تھی۔ گھر کے کسی بزرگ مرد کی مخالفت کے مقابلے میں گھر کی خواتین کی کوئی ضرورت بھی لائقِ اعتنا نہیں سمجھی جاتی تھی۔ یعنی زنانہ رسالوں کی خریداری خواتین سے زیادہ مردوں کی مرضی اور منظوری پر منحصر ہوتی تھی، اور زنانہ رسائل کی تعدادِ اشاعت کی بنیاد پر کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے یہ باتیں ذہن میں رکھنی ضروری ہیں۔

دوسری بات قابلِ توجہ یہ ہے کہ معلم، اخبار النساء اور شریف بیبیاں، ان تینوں جریدوں کا مقصد عورتوں کو تربیت دینا تھا اور ان کے مرد مدیروں کے ذہن میں 'عورت' سے مراد ہوتی تھی، ایک سماجی تقاضوں اور عیالی رشتوں کی بنیاد پر ڈھالی ہوئی ہستی، یعنی بیٹی، بیوی یا ماں۔ **حالی** نے جب عورتوں کو خطاب کیا تھا تو انھیں مائیں، بہنیں اور بیٹیاں ہی کہا تھا۔ **منشی محبوب عالم** بھی جب شریف بیبیاں، نکالتے ہیں تو وضاحت کر دیتے ہیں کہ وہ اس اخبار کے ذریعہ ہر بیٹی کو سعادت منداور لائق، ہر بیوی کو سلیقہ شعار اور نیک بخت اور ہر ماں کو عقل منداور اور مہربان بنانا چاہتے ہیں۔ ان رسالوں کو پڑھتے وقت کسی بھی عورت کو اپنے سماجی بلکہ آیلی کردار سے باہر یا الگ ہو کر سوچنے کے لیے گنجایش کم ہی تھی۔ یہ رسالے عورتوں کو ان کے فرایض سے زیادہ آگاہ کرتے تھے اور ان کے حقوق کی تشریح بھی ان کے ان سماجی رشتوں کے تحت ہوتی تھی جو مردوں سے منسلک تھے۔ دوسرے لفظوں میں، ان رسالوں میں عورتوں کو محض ایک باشعور ہستی کے طور پر لطف اندوز ہونے یا غور کرنے کے لیے کم ہی مواد ہوتا تھا۔ چنانچہ ان رسالوں میں عورتوں کی تحریریں مردوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتی تھیں۔ ان رسالوں کے برخلاف تہذیبِ نسواں، کے سرورق پر صرف یہ درج ہوتا تھا:

ہر شنبہ کو ایک شریف بی بی کی ایڈیٹری میں
لڑکیوں کے لیے شائع ہوتا ہے۔

یعنی صرف عمر اور جنس کی تخصیص ہی مدِّ نظر تھی۔ یہ بھی ایک اندازِ بیان تھا ورنہ اس کے مشمولات ہر عمر کی عورتوں کی دلچسپیوں کو مدِّ نظر رکھتے تھے۔ یہاں لفظ 'لڑکی' کا استعمال اہم ہے۔ یہ اسے رفیقِ

نسواں' سے جداگانہ بناتا ہے، جس کے سرورق پر درج ہوتا تھا: "مخصوص عورتوں کے لیے۔"

منشی ممتاز علی کو جنھیں فرایضِ نسواں سے کہیں زیادہ حقوقِ نسواں کی فکر تھی، خواتین کے لیے ایک مخصوص رسالہ نکالنے کا خیال کب آیا، یہ کہنا مشکل ہے، البتہ ہم یہ جانتے ہیں کہ ۱۸۹۷ء میں **محمدی بیگم** سے نکاح کے چند ہی دنوں بعد دونوں نے یہ طے کرلیا تھا کہ انھیں ایک خاص انداز کا رسالہ نکالنا ہے، جس کی ادارت کے فرایض **محمدی بیگم** ادا کریں گی اور طباعت واشاعت وغیرہ کی ذمہ داری **ممتاز علی** بحیثیت منیجر ادا کریں گے۔ یہ تفصیل ہمیں اس انتہائی اہم مضمون میں ملتی ہے جو' تھذیبِ نسواں' کے عنوان سے **ممتاز علی** نے ۱۹۱۸ء میں شائع کیا تھا اور جس سے ایک اقتباس اوپر دیا جاچکا ہے۔ اسی مضمون میں **ممتاز علی** یہ بھی بتاتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے **محمدی بیگم** کے تمام خدشات کو دور کیا اور ادارت کا کام سنبھالنے سے قبل ان کے لیے دو استانیاں مقرر کیں جو **محمدی بیگم** کو **انگریزی** اور **ھندی** سکھاتی تھیں۔ ان کے علاوہ خود **ممتاز علی** انھیں **عربی** اور **فارسی** پڑھاتے تھے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شادی سے قبل **محمدی بیگم** جاہل مطلق تھیں۔ خوش قسمتی سے ہمیں ایک ایسی تحریر مہیا رہی جو شادی سے قبل کی ہے اور جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت بھی **محمدی بیگم** کو **اردو** اور **فارسی** پر خاصا عبور حاصل تھا اور وہ **اردو** میں خیالات کا اظہار بخوبی کرلیتی تھیں۔ یہ ایک خط ہے جو انھوں نے اپنے والد کو لکھا تھا اور جو ان کی کتاب 'رفیقِ عروس' کے دوسرے ایڈیشن میں شامل ہے۔ نکاح سے قبل ان کے والد نے انھیں ایک معقول رقم دی تھی اور ایک خط ہدایات سے بھرا بھیجا تھا۔ اپنے والد کے اسی خط کی بنیاد پر **محمدی بیگم** نے اپنی کتاب 'رفیقِ عروس' تصنیف کی جو ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں انھوں نے وہ خط بھی شامل کیا تھا جو انھوں نے اپنے والد کو شادی سے قبل جواب میں لکھا تھا۔ اس کا ایک مختصر اقتباس یہاں دینا ضروری ہے تاکہ **محمدی بیگم** کی وہ لیاقت جو شادی سے قبل انھیں حاصل تھی، ظاہر ہوجائے اور کچھ یہ بھی اندازہ ہوجائے کہ معاشی طور پر بہتر طبقے کی خواتین میں اس وقت بھی نوشت وخواند کا معیار کتنا بلند ہوسکتا تھا۔

آپ تحریر فرماتے ہیں:

جو ایك هزار روپیه نقد میں تم کو دیتا هوں وه

کچھ شئے نہیں۔' میں درگاہِ الٰہی سے ایک لوتھڑا گوشت اور ایک مٹھی ھڈیوں کی دنیا میں بھیجی گئی تھی۔ خداوند کریم کا فضل اور آپ کی مہربانی اور شفقت ھے کہ روزِ پیدایش سے لے کر آج تک آپ کے زیرِ سایہ پرورش پارھی ھوں۔ سیکڑوں تھان کپڑوں کے اور لاکھوں من خوراک خدا کی بخشش اور آپ کی شفقت سے کھا پھن چکی ھوں۔ ایک ھزار چھوڑ لاکھوں روپے آ پ کی ذات کی برکت سے مجھ پر صرف ھوچکے ھو ں گے۔ میرا ایک ایک ناتواں عضو اور بال بال آپ کی دولت اور محبت سے پلا ھوا ھے۔ جو دولت آپ کی مجھ ناتواں اور نا سمجھ کی پرورش پر صرف ھوئی، وہ میری نظروں میں اس قدر ھے جس کا شمار نہیں۔ پس میں نے آپ کا بے حساب روپیہ لیا ھے، جس کی میں گنتی تک نہیں بتاسکتی۔[۹]

واضح رہے کہ اس تحریر کے وقت **محمدی بیگم** کی عمر بیس سال کی تھی۔

محمدی بیگم اور **سید ممتاز علی** کا ازدواجی تعلق نومبر ۱۸۹۷ء میں قائم ہوا، اس نے ایک طرح سے **ممتاز علی** کی زندگی کو وہ استقلال اور مقصدیت بخشی جس کی انھیں تلاش تھی اور جو اس وقت تک حاصل نہیں ہوئی تھی۔ شادی کے فوراً بعد انھوں نے طباعت اور اشاعیت کا کام باقاعدہ شروع کردیا۔ دار الاشاعت پنجاب کی بنیاد ڈالی اور یہ اعلان کردیا کہ وہ جلد ہی خواتین کے لیے ایک مخصوص انداز کا ہفتہ وار رسالہ شائع کرنا شروع کریں گے جس کی مدیر ایک خاتون ہی ہوں گی۔ چنانچہ یکم جولائی ۱۸۹۸ء کو تھذیبِ نسواں ' کا پہلا شمارہ ایک شریف بی بی کی ایڈیٹری میں مرتب ہوکر بازار

میں آ گیا۔ ۸ صفحات اور صاف ستھری طباعت کے اس رسالے کا سالانہ چندہ محض سوا تین روپے تھا۔ ایک سال کے بعد صفحات کی تعداد ۱۲ ہوگئی لیکن قیمت وہی رہی۔ ۱۹۰۵ء میں صفحات کی تعداد مزید بڑھی یعنی ۱۶ ہوگئی لیکن قیمت میں اضافہ نہیں ہوا۔

ظاہر ہے کہ 'شریف بی بی' کے پردے میں **محمدی بیگم** ہی اس کی ایڈیٹر تھیں، لیکن ابتدا کے شماروں میں 'ایڈیٹری دوئمی' کا بھی ذکر ملتا ہے اور ان کے تحریر کردہ مضامین بھی ملتے ہیں۔ یہ خاتون کون تھیں، اس کا پتا مجھے نہیں مل سکا ہے۔ ۴ر نومبر ۱۸۹۹ء کے شمارے میں ایک خبر ضرور نظر سے گزری کہ چند دن پہلے ان "پیاری بھن ایڈیٹر دوئمی صاحبہ کے بھنوئی حکیم معراج الدین صاحب" کا انتقال ہوگیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ شریک کار وہ **عمدہ بیگم صاحبہ** ہوں جو وکٹوریہ گرلز اسکول میں معلم تھیں اور جن کی **محمدی بیگم** سے گہری دوستی تھی۔ لیکن یہ کوئی مستقل عہدہ نہ تھا کیوں کہ بعد کے شماروں میں کسی 'ایڈیٹر دوئمی' کا ذکر نہیں ملتا۔

اس رسالے کے نام کی بھی ایک دلچسپ کہانی ہے، جس کی تفصیل **ممتاز علی** کے مذکورہ بالا مضمون میں ملتی ہے۔ رسالہ شروع کرنے کا فیصلہ کر لینے کے بعد **ممتاز علی** اور **محمدی بیگم** نے **سرسید** کو ان چند ناموں کی فہرست، جو ان کے ذہن میں آئے تھے، اس درخواست کے ساتھ بھیجی کہ ان میں جو نام مناسب سمجھیں اس پر صواد لگا دیں۔ **سرسید** کو ان میں سے کوئی نام اچھا نہ لگا۔ چنانچہ بادلِ ناخواستہ — کیوں کہ وہ سرِ رے سے اس طرح کے رسالے کے اجرا کے حق میں نہ تھے — انھوں نے اپنے معروف جریدے 'تہذیب الاخلاق' کے انداز پر ایک نیا نام 'تہذیبِ نسواں' تجویز کیا۔ دونوں نے اسے طیب دل سے قبول کیا اور جب پہلا شمارہ شائع ہوا تو اسی نام کا طغرا، اس کی پیشانی پر درج تھا۔ یہ طغرا، ایک مدت تک استعمال کیا جاتا رہا لیکن نام کی عربی ترکیب مقبول نہ ہوئی۔ پڑھنے والوں نے اور خود بانیوں نے، جلد ہی اس کی فارسی عام فہم شکل 'تہذیبِ نسواں' کو اپنا لیا اور بالآخر خود رسالے کے سرورق پر بھی یہی نام درج کیا جانے لگا۔

یہاں یہ وضاحت لازمی آتی ہے کہ گو **سرسید** رسالے کے اجرا کے خلاف تھے، وہ عورتوں کی تعلیم اور رفاہ کے مخالف نہیں تھے۔ ان کی ترجیحات **ممتاز علی** سے مختلف ضرور تھیں، لیکن ایک دوسرے کی ضد کبھی نہ تھیں۔ دونوں بزرگوں کی کوششیں ہندوستانی (یعنی شمالی ہند کے بیش تر اردو خواں 'شریف')

مسلمانوں کے حالات کو بہتر بنانے پر مرکوز تھیں۔ البتہ **سرسید** فی الوقت اس طبقے کے نوجوان مردوں پر ہی اپنی قوم کی توجہ جمائے رکھنا چاہتے تھے، جب کہ **ممتاز علی** ان شرفا کی اناث کو بھی ان مساعی سے براہِ راست بہرہ مند ہونے والوں میں فی الفور شامل کرنا چاہتے تھے۔

سرسید کے خیالات اس تحریر میں واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں جو **ممتاز علی** نے حقوقِ نسواں 'میں شائع کی تھی۔ یہ ایک خط ہے جو **سرسید** نے **ممتاز علی** کو لکھا تھا (تاریخ ندارد) اور جو **تعلیمِ نسواں** کے بارے میں استفسار کا جواب تھا:

> میری نہایت دلی آرزو ہے کہ عورت کو بھی نہایت عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی جاوے۔ مگر موجودہ حالت میں کنواری عورتوں کو تعلیم دینا ان پر سخت ظلم کرنا اور ان کی تمام زندگی کو رنج و مصیبت میں مبتلا کردینا ہے۔ کنواری لڑکیاں تمام عمر بے شادی کے بلحاظ حالات ملک کے رہ نہیں سکتیں۔ اور نہ ان کی زندگی بسر ہوسکتی ہے۔ پس ضرور ان کی شادی کرنی ہوگی۔ ہماری قوم کے لڑکوں کی جو ابتر وخراب حالت ہے... اور جو بد طریقہ ان کا اپنی جوروؤں کے ساتھ ہے وہ اظہر من الشمس ہے... جوروؤں کو لونڈیوں سے بدتر سمجھتے ہیں اور کوئی بداخلاقی ایسی نہیں جو جوروؤں کے ساتھ نہیں برتتے۔ اب خیال کرو بے ترتیب لڑکی پر یہ مصیبت صرف ایک حصہ ہے۔ اس کو خود خیالات عمدہ تہذیب کے نہیں ہیں اس لیے (اس) کو اپنے خاوند کی بداخلاقی

صرف بقدرِ ایك حصه کے رنج ومصیبت میں
رکھتی ھے۔ ... مگر جب وہ خود شایستہ ومہذب
وتربیت یافتہ اور عالی خیال ھوتو یہ تمام
معلومات اس کی روح کو بھت زیادہ رنج دیتے
ھیں اور اس کو زندگی بلائے جان ھوجاوے
گی۔[۱۰]

سرسید کے نزدیک یہ تو ضرور ممکن تھا کہ شایستہ شوہر اپنی غیر شایستہ بیوی کو اپنے پایہ تک لے آئے، لیکن ملک کے حالات کے تحت وہ یہ ناممکن سمجھتے تھے کہ کوئی شایستہ بیوی اپنے غیر شایستہ شوہر کی عادات واطوار درست کر سکے گی۔ ہم ان کی منطق میں خامی نکال سکتے ہیں، لیکن انھیں **تعلیمِ نسواں** کا مخالف قرار دینا درست نہ ہوگا۔ (یاد رہے کہ خود سرسید نے بچپن میں قرآن ناظرہ ایک پردہ نشین استانی کی زیرِ ہدایت ختم کیا تھا) **ممتاز علی** اس خط کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

اس مرض کا علاج بجز اس کے کچھ نہیں کہ
بچپن سے لڑکوں کی بھی، جو رشتہ کے لیے
منتخب ھونے کے قابل ھوں، تلاش رکھی جائے
اور ان کی تربیت اپنی نگرانی میں کرائی جائے
اور رشتہ داری کا دائرہ اپنے خاندان پر ھی
محدود نہ کیا جائے... اور لڑکوں کی تعلیم میں
اور زیادہ کوشش کی جائے کہ بجز اس کے اور
کوئی علاج ان خرابیوں کا نہیں۔[۱۱]

'تہذیبِ نسواں' کا خواب **ممتاز علی** نے دیکھا تھا، لیکن وہ حقیقت تبھی بن سکا جب **محمدی بیگم** ان کی زندگی میں داخل ہوئیں۔ یہ اردو کی انتہائی بدنصیبی ہے کہ دونوں کی ازدواجی زندگی اور اپنی اولاد معنوی کی پرورش اور تربیت میں لامثال سا جھے داری کی مدت صرف دس سال ہی ہو پائی اور نومبر ۱۹۰۸ء میں **محمدی بیگم** کی وفات کے ساتھ ختم ہوگئی۔ **سید صاحب** نے دوبارہ شادی نہیں کی اور باقی زندگی

تہذیبِ نسواں' کوسنوارنے اور تنومند بنانے میں صرف کردی۔ مرحوم بیوی کی خواہش کی تکمیل کی خاطر انھوں نے ایک نیا ہفتہ وار رسالہ پھول' کے نام سے نکالنا شروع کیا جو کم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس کی بھی پہلی مدیر ایک خاتون تھیں، جو بعد کو **نذر سجاد حیدر** کے نام سے مشہور ہوئیں۔ یہ رسالہ بھی اتنا ہی دیرپا، موثر اور مقبول ثابت ہوا جتنا کہ تہذیبِ نسواں'۔

محمدی بیگم نے جس طرح تہذیبِ نسواں' کو قائم کرنے اور ترقی دینے میں اپنی جان کھپائی تھی، اس کا کچھ اندازہ ان دو مواقع سے کیا جاسکتا ہے، جن کا تذکرہ **ممتاز علی** نے ان کے انتقال کے چار سال بعد ایک مضمون میں کیا تھا:

> (۱) مدت کی بات ہے، امتیاز علی سلمہ، شیر خوارگی کے زمانے میں مرض نمونیا میں گرفتار ہوگیا اور یاس تک حالت پہنچ گئی۔ اس کی حالت دیکھ کر نہ میں اپنے دل اور آنکھوں پر قابو رکھ سکا تھا نہ اس کی والدہ۔ ہر چند اللہ کی ذات پر بھروسہ تھا مگر ظاہر حالت یہ تھی:
>
> **اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند**
>
> نہ بچے کی کھانسی تھمتی تھی نہ پیاس بند ہوتی تھی۔ نمونیا کا بخار اور اس کی تیزی اللہ کی پناہ... بچے کی ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار نہ ٹوٹتا تھا، عین اس حالت میں بھی وہ اخبار کا مضمون لکھ رہی تھیں۔ آنسو جاری تھے، دل بے تاب تھا، مگر قلم چل رہا تھا۔ اخبار کو اپنے وقت پر ضرور نکالنا تھا۔
>
> (۲) ایڈیٹر صاحبہ مرحومہ کے والد کا انتقال ہوا۔ گھر میں کھرام مچا ہوا تھا۔ کمرے میں

جنازہ رکھا تھا۔ سارا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔
اخبار کا پروف آیا۔ روتی جاتی تھیں اور پروف
کو درست کرتی جاتی تھیں۔[۱۲]

محمدی بیگم کی وفات کے بعد ادارت کی ذمہ داری **وحیدہ بیگم** نے سنبھالی جو **ممتاز علی** کی پہلی بیوی سے صاحبزادی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد **ممتاز علی** کی بہو، **آصف جہاں** (**بیگم حمید علی**) مدیر مقرر ہوئیں اور کافی عرصہ رسالے کو اسی انداز پر کامیابی سے نکالتی رہیں۔ جب **محمدی بیگم** کی واحد اولاد **امتیاز علی** (**تاج**) فارغ التحصیل ہو گئے تو ان کا دخل دونوں رسالوں میں بڑھا اور ایک وقت آیا جب دونوں رسالے ان کی ادارت میں شائع ہوتے تھے۔ تہذیبِ نسواں ' میں کئی دوررس تبدیلیاں انہی کی کوششوں سے ہوئیں۔ مثلاً ہر ماہ ایک خاص نمبر عام شماروں سے ضخیم ایک ماہنامہ کے انداز سے طبع کیا جانے لگا۔ معلوماتِ عامہ، سیاسی خبریں، فکشن، تراجم کے صفحات بڑھے، تصویروں کا اضافہ ہوا۔ غرض کہ ان کے زمانے میں بھی رسالے نے ترقی کی۔ لیکن یہ بھی ہوا کہ مردوں کی تحریریں زیادہ نظر آنے لگیں۔ اگرچہ نئی خواتین کی نگارشات میں کمی نہیں آئی لیکن جیسے جیسے مروّجہ 'مردانے' رسالوں میں بھی خواتین کی تحریریں شائع ہونے لگیں خود کئی خواتین نے تہذیبِ نسواں ' سے وہ خاص تعلق قائم نہ رکھا جو وہ پہلے رکھتی تھیں۔ ڈاکٹر **نسیم آرا** نے چاروں مدیروں کی مدت کار کا نقشہ اس طرح بنایا ہے۔ **محمدی بیگم** (۱۹۰۸-۱۸۹۸ء)، **وحیدہ بیگم** (۱۹۱۷-۱۹۰۸ء) **آصف جہاں** (۱۹۲۵-۱۹۱۷ء) اور **امتیاز علی تاج** (۱۹۵۱-۱۹۲۵ء)۔ ۱۹۵۱ء میں یہ رسالہ بند کر دیا گیا۔ میرے خیال میں **اردو** میں شاید ہی کوئی اور رسالہ اس پابندی سے ۵۳ برس تک شائع ہوتا رہا ہوگا۔

یہ سوچنا کہ تہذیب نسواں ' کو اول دن سے قبولیت ملی، ایک بڑی غلطی ہوگی۔ ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ **سید ممتاز علی** لکھتے ہیں:

میں چھے مہینے تك هر هفته هزار اخبار چھپواتا
تھا اور سِول لسٹ سے نام دیکھ کر معزز گھرانوں
میں اخبار بھجواتا تھا۔ چند اخباروں کے سوا
سب اخبار بمطابق "کالاے بدبریشِ خاوند"

واپس آتے تھے۔ اسی طرح تین مہینے گزر گئے
مگر مجھے ۲۰/۷۰ خریداروں سے زیادہ نہ ملے۔
ان معزز خاندانوں میں کچھ ایسے بھی ہوتے جو
اخبار کے پیکٹوں پر بازاری گالیاں لکھ کر
واپس کردیتے۔ لاہور کے معززانِ گرامی کو یقین
ہی نہ آتا تھا کہ اخبار کی ایڈیٹر کوئی خاتون
ہے اور وہی یہ تمام مضامین لکھتی ہے۔[۱۳]

چنانچہ ایک دفعہ ایک یورپین لیڈی کو خاص عنوان بتا کر زنانے میں بھیجا گیا کہ وہ اپنے سامنے اس موضوع پر مضمون لکھوا کر لائے۔ اس امتحان میں بھی **محمدی بیگم** کامیاب رہیں لیکن لوگوں کا منفی رویہ نہ بدلا۔ اخباروں نے مخالفت کی۔ یہاں تک کہ **شیخ عبدالقادر** کے "مخزن" نے بھی حمایت کی بجائے مخالفت کی جیسا کہ **محمدی بیگم** کی ایک نظم میں اشارہ ملتا ہے۔ استثنا میں انھوں نے صرف رفیقِ ہند (مدیر محترم **علی چشتی**) کا نام دیا ہے:

فرقۂ اخبار جو ہے مدعیِ دردِ قوم
وِرد جس کا رات دن ہے 'ہائے قوم' اور 'وائے قوم'
کیا انھوں نے واسطے 'تہذیبِ نسواں' کے کیا
ان کا دل تہذیب کے حق میں تو پتھر ہوگیا
جن کو 'قادر' تھا مدد پر ہر طرح حق نے کیا
'مخزنِ' بے لطفی دل افسوس ان کا ہوگیا
دل دُکھا یا جی جلایا کانٹے بوئے راہ میں
یہ صلے اہلِ وطن سے ہیں ملے بہنوں ہمیں
پر 'رفیقِ' قوم سب میں بول بالا ہے ترا
مرد و زن پر 'ہند' کے یکساں اجالا ہے ترا
تو نہ بھولا اس ہماری کوششِ ناچیز کو

حوصلہ تو نے دلایا پرچۂ 'تہذیب' کو [۱۴]

ان حالات میں بھی 'منیجر' (**ممتاز علی**) اور 'ایڈیٹر' (**محمدی بیگم**) دونوں نے نہ صرف امید نہ چھوڑی بلکہ طرح طرح سے 'تہذیبِ نسواں' کو خوب تر بھی بناتے رہے۔ صفحات کے اضافے کے ساتھ مشمولات میں تنوع بھی پیدا کیا۔ خبروں کے صفحات میں نمایاں اضافہ ہوا جو شاید اس وقت مردانہ حلقوں میں تعجب سے دیکھا گیا ہو۔ مضمون نگاروں کا حوصلہ بڑھانے اور نئے لکھنے والیوں کو مائل کرنے کے لیے انعامات دیے جانے لگے۔ **ممتاز علی** کا بیان ہے کہ چار سال گزرنے کے بعد بھی رسالے کے خریدار ۳۰۲ سے زیادہ نہ بڑھے تھے، لیکن رفتہ رفتہ حالات سدھرنے لگے۔ خریدار بھی بڑھے اور لکھنے والوں کی تعداد بھی۔ جنوری ۱۹۰۵ء میں خریداروں کی تعداد چھے سو تھی لیکن خوشی کی بات یہ تھی کہ اگر ۱۹۰۲ء میں ایڈیٹر اور منیجر کے مضامین کی تعداد ۹۰ ہوئی تو ۱۹۰۴ء میں گھٹ کر ۳۶ رہ گئی تھی۔ اس کامیابی سے دونوں کا حوصلہ اتنا بڑھا کہ انھوں نے ایک نیا رسالہ 'مشیرِ مادر' کے نام سے کنخدا عورتوں کے لیے نکالنا شروع کر دیا۔ بدقسمتی سے ابھی اس رسالے کے قدم جمنے نہ پائے تھے کہ **محمدی بیگم** کا انتقال ہو گیا اور **ممتاز علی** کو وہ رسالہ بند کر دینا پڑا۔ بہرحال ۱۹۰۵ء کے بعد سے 'تہذیبِ نسواں' کے ناظرین کا حلقہ تسلسل سے پھیلتا گیا؛ ملک کے دور دراز علاقوں میں بھی اس کے خریدار بن گئے اور اس کا نام احترام اور التفات کے ساتھ لیا جانے لگا۔

'تہذیبِ نسواں' کی بیسویں سالگرہ کے موقع پر **ممتاز علی** نے ایک طویل مضمون خاص اس رسالے کے بارے میں لکھا جس کا حوالہ ہم اوپر دے چکے ہیں اور جو اس کتاب میں بھی شامل ہے۔ اس میں انھوں نے ایک نمایاں سرخی دے کر رسالے کی خصوصیتیں بیان کیں ہیں۔ سرِ فہرست رسالے میں استعمال کی جانے والی زبان کی سادگی اور سلاست ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> بعض خواتین جنھیں عالمانہ اور مردانہ انداز کی تحریریں پسند ہیں، کہا کرتی ہیں، تمہارے اخبار میں کوئی کیا مضمون لکھے، یہ تو چڑے چڑیا کی کہانی لکھنے کا اخبار ہے۔ یہ انھوں نے طنزاً کہا مگر ہمیں اسی سادگی اور سلاست پر

فخر ھے، اور ھمیں یہ دعویٰ ھے کہ ھم مشکل سے
مشکل مضمون کو اس طرح سے لکھ سکتے ھیں
جسے بچیاں آسانی سے سمجھ سکیں۔[۱۵]

سید صاحب کا یہ دعویٰ بے جا نہ تھا۔ واقعی خاصے 'مردانہ' موضوعات پر بھی جو مضامین شائع ہوتے تھے (اور جو بیش تر خواتین کے تحریر کردہ ہوتے تھے) ان میں بھی زبان اور بیان دونوں کی سلاست نمایاں ہوتی تھی۔ ایک بات اور بھی ہوتی تھی (جس کا احساس **سید صاحب** کو ضرور رہا ہوگا) وہ یہ کہ ان تحریروں میں 'عالمانہ' داؤں پیچ کی جگہ ذاتی تجربہ اور جذبہ کی صداقت کو بنیاد بنایا جاتا تھا، جس سے تحریر مزید موثر ہو جاتی تھی۔ ۲۶ر نومبر ۱۹۰۴ء کے شمارے میں **منشی محبوب عالم** کی صاحبزادی **فاطمہ بیگم** نے **'مس محبوب عالم'** کے نام سے ایک تحریر شائع کی جو مسئلہ تقدیر و تدبیر سے متعلق تھی۔ یہ بحث کئی ماہ چلی اور متعدد خواتین نے حصہ لیا۔ ان کی تحریروں سے دو اقتباس ملاحظہ ہوں (مجھے افسوس ہے کہ **مس محبوب عالم** کے مضمون تک میری رسائی نہیں ہو سکی):

۱۔ جتنے فنون وھنر ھیں کبھی تو تدبیر کے سامان ھیں، کبھی خود سراپا تدبیر ھیں۔ اللہ پاک کا کبھی یہ مقصود نھیں کہ کوئی آدمی تقدیر پر شاکر رہ کر تدبیر چھوڑ دے۔ تدبیر ایسی شئے نھیں جو انسان سے چھٹ سکے... کیا کھانا پکانا پیٹ بھرنے کی تدبیر نھیں؟ کپڑا منگواکر سینا پرونا ستر پوشی کی تدبیر نھیں؟ مکان بنانا عافیت سے رھنے کی تدبیر نھیں؟ بیماری میں دوا درمن اور پرھیز کرنا حصولِ صحت کی تدبیر نھیں؟ غرض انسانی زندگی کا کوئی کام بے تدبیر نھیں چل سکتا۔
(راقمہ سید از تِتھلی)[۱۶]

۲۔ کہا جاتا ہے کہ سب کام خدانے کیے مگر کام کا واسطہ بندوں کو ٹھہرایا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بخارات کو حرارت نے پیدا کیا اور بخارات نے ابر بنایا۔ ابر نے مینہ برسایا۔ بارش نے کھیت میں پڑے ہوئے دانے کو اگایا جس کو کاشت کار نے بویا تھا، اور اُگے ہوئے درخت میں سے دانہ کاشت کارنے نکالا۔ پھر پیسنے والی نے پیسا، اور پکانے والی نے پکایا اور جناب ایڈیٹر صاحبہ آپ نے کھایا۔ یہ سارے کام میں نے لوگوں یا چیزوں کی طرف منسوب کیے اور حقیقت میں انھیں اشیاء کی طرف منسوب کرنا درست اور موافق کارخانۂ عالم کے ہے۔ اگر چہ خدا نے ہی ان سب چیزوں اور آدمیوں کو ان کاموں کے کرنے کی صلاحیت اور طاقت بخشی ہے۔۔ اور اس وجہ سے کہ وہی اس روٹی کے پیدا ہونے اور پکانے کا اصلی سبب ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے سب کام کیے، لیکن اسباب ظاہری اور اسباب قریب یہی چیزیں ہیں جن کا ذکر ہوا۔ پس ان چیزوں کو سبب کہنا غلط نہیں۔

(راقمہ: ط خ از مرادآباد)[۱۷]

رسالے کی زبان کو سریع الفہم بنانے کے لیے **ممتاز علی** نے اتنا اہتمام کیا کہ کتابت اور علامت وقف لگانے کے باقاعدہ اصول بنائے اور ان کو پابندی سے رسالے میں استعمال بھی کیا۔ **اردو** کے لمبے لمبے جملوں کو چھوٹے چھوٹے فقروں کی شکل دے کر کتابت کروانے سے وہ جملے کم عمر ناظرین

کے لیے بھی زود فہم بن جاتے تھے جو ان کا خاص مقصد تھا۔ یہاں یہ یاد رکھنا شاید ضروری ہے کہ اس وقت لاتعداد کتابیں **اردو** میں اسی انداز میں چھپتی تھیں جیسے مشینی طباعت سے قبل مخطوطات کی شکل میں تیار کی جاتی تھیں یعنی علامات اور اوقاف سے معرّیٰ۔ میرے نزدیک یہ بات بہت اہم ہے کہ رسالے کی ابتدا سے **سید ممتاز علی** نے دو باتوں کا خاص اہتمام کیا تھا: علاماتِ اوقاف کی پابندی اور عالمی اور ملکی خبروں کے لیے دو تین صفحات کو مختص کر دینا۔ یعنی ایک طرف **اردو** عبارت کو لڑکیوں کے پڑھنے کے لیے آسان بنانا، دوسری طرف انہی لڑکیوں کی توجہ ان کے محدود حلقۂ تصرف سے باہر نکال کر اس وسیع تناظر اور ان 'مردانہ' معاملات کی طرف کرنا جو عموماً اُن کے بھائیوں کے لیے مناسب سمجھے جاتے تھے۔ حالاتِ حاضرہ اور معلوماتِ عامہ سے کسی قدر واقف ہو کر یہ لڑکیاں اب اس گفتگو میں کبھی کبھی شریک ہونے کی جرأت کر سکتی تھیں۔ جو ان کے خاندان کے مردوں کا ہی حق سمجھی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں پہلا قدم تو **نذیر احمد** نے اٹھایا تھا اور اپنی دوسری تصنیف 'بنات النعش' کا خاصۂ مقصود 'معلوماتِ علمی' کو قرار دے کر اس کتاب میں **معاشیات**، **سیاسیات**، **جغرافیہ**، **طبیعات** وغیرہ کی بنیادی باتوں کو دلچسپ مکالموں کی شکل دے کر کم عمر لڑکیوں کے لیے مہیا کر دیا تھا، لیکن ان کے بعد دوسرے بزرگوں، مثلاً **سید احمد دہلوی**، **الطاف حسین حالی** نے اصلاحِ رسوم و معاشرت کو ہی زیادہ اہمیت دی تھی۔ 'تہذیبِ نسواں' نے ان تمام موضوعات کو جنھیں **نذیر احمد** نے 'بنات النعش' میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ضروری قرار دیا تھا، ایک بار پھر اخلاقیات اور اصلاحِ معاشرت کے مساوی حیثیت دے کر پیش کرنے کی سعی کی۔ یہاں یہ یاد دلانا نامناسب نہ ہوگا کہ اسی زمانے میں **مولانا اشرف علی تھانوی**، مصنف 'بہشتی زیور' بھی عورتوں کے مسائل پر غور کر رہے تھے اور جب انھوں نے ۱۹۰۶ء میں اپنی مشہورِ زمانہ کتاب شائع کی تو اس میں جہاں متعدد دیگر کتابوں کو عورتوں کے مطالعے کے لیے نامناسب بلکہ مضر قرار دیا، وہیں 'بنات النعش' کو بھی اسی فہرست میں ڈال دیا تھا۔ 'معلوماتِ عامہ' کو وہ مستورات کے لیے نہ صرف غیر ضروری بلکہ اندیشہ ناک سمجھتے تھے۔

ممتاز علی کے ذہن میں 'تہذیبِ نسواں' کے کیا مقاصد تھے، اس کی تصریح انھوں نے ۱۸۹۸ء میں رسالے کی اشاعت سے قبل اس طرح کی تھی:

ہم نے ارادہ کیا ہے کہ یکم جون ۱۸۹۸ء سے انشاء

الله ایك اخبار لڑکیوں کے لیے پاکیزہ مضامین کا
شائع کریں، جس میں ان کی تعلیم اور کتب
تعلیم اور طریقِ تعلیم اور سلیقه خانه داری
وغیره مضامین پر بحث هوا کرے۔[۱۸]

مجھے رسالے کا پہلا شمارہ دیکھنے کی سعادت ابھی تک نصیب نہیں ہوئی جو پتا چلتا کہ اس میں اس کے مقاصد کے تعلق سے **ممتاز علی** نے کیا لکھا تھا۔لیکن ہمارے پاس وہ اہم بیان ہے جو ان کے متذکرہ بالا مضمون (۱۹۱۸ء) میں ملتا ہے:

یه اخبار عورتوں کی اصلاح اور عورتوں کے
حقوق کی حفاظت کے لیے نکلا ھے۔

پھر وہ اضافہ کرتے ہیں:

مگر یه اصلاح اور یه حفاظت کس طرح کی
جائے؟ شریعت کی حدود کے اندر رہ کر اور اپنی
شرافت کو قائم رکھ کر۔ یه نهیں که مردوں سے
لڑائی کی جائے۔'

عورتوں کی اصلاح سے ان کی کیا مراد تھی؟ اس کی تصریح بھی ملتی ہے:

عورتوں کی اصلاح میں داخل ھے خانه داری کا
انتظام، بچوں کی پرورش اور تعلیم وتربیت،
گھر کی حفظ صحت کا انتظام، گھر کے بزرگوں
کے باب میں اپنے فرائض کی انجام دھی۔ ان سب
فرائض کا تهذیبِ نسواں' میں همیشه خیال رکھا
گیا ھے۔

حقوقِ نسواں سے **ممتاز علی** کا شغف ظاہر ہے اسی بات سے عیاں ہوجاتا ہے کہ ان کی پہلی مطبوعہ کتاب کا موضوع اور نام ہی 'حقوقِ نسواں' تھا۔ یہ کتاب گو ۱۸۹۸ء کے نصف اول میں

شائع ہوئی، لیکن تصنیف اور تکمیل کے مراحل بہت پہلے طے کر چکی تھی۔ عام خیال یہ ہے کہ اسی کتاب کا مسودہ **سرسید** کے غیض وغضب کا شکار ہوا تھا اور اس کے پھاڑے ہوئے ٹکڑے **ممتاز علی** حسنِ اتفاق سے بچا پائے تھے۔ لیکن یہ سمجھنا مناسب نہ ہوگا کہ مطبوعہ کتاب کا متن وہی ہے جو اس مسودے کا تھا۔ مطبوعہ کتاب میں کوئی ایسی اصولی بات نہیں نظر آتی جس پر **سرسید** کو اتنا شدید غصہ آیا ہوگا۔ پھر یہ کتاب **سرسید** کی زندگی ہی میں شائع کی گئی تھی اور **ممتاز علی** کو **سرسید** سے جو عقیدت اور تعلقِ خاطر تھا، اس کی بنا پر یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ انھوں نے یہ کتاب ایک مدت گزر جانے کے بعد محض ضد میں اسی طرح بغیر کسی ردوبدل کے شائع کر دی ہوگی۔

'حقوقِ نسواں' میں جن حقوق کا ذکر کیا گیا ہے اور جنھیں واقعی اور اسلامی قرار دیا گیا ہے وہ ہمارے جانے پہچانے ہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کا حق یا 'پردہ' کے ساتھ گھر سے باہر دنیا کے کاروبار میں حصہ لینے کا حق، اپنی مرضی سے نکاح ختم کرنے کا حق (خلع) میرے خیال میں جو بات اس کتاب کو 'ریڈیکل' بناتی ہے اور دوسری کتابوں سے جدا گانہ ہے، وہ ان حقوق کو درست اور اسلامی قرار دینے سے پہلے کی تمہیدی بحث ہے۔ پہلے باب کا عنوان ہے 'مردو کی جھوٹی فضلیت'۔ **ممتاز علی** کے ذہن میں نہ صرف یہ صاف تھا کہ عورتوں کو اسلام نے ایسے حقوق دیے ہیں جو ان کی موجودہ زندگی کو خوش گوار اور مطمئن کُن بنا سکتے ہیں، بلکہ ان کی سوچ نے انھیں اس کا بھی قائل کر دیا تھا کہ حقوق اور فرایض کے اعتبار سے مردوں اور عورتوں میں پوری مساوات — شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے — اسلام کی تعلیم ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک مردوں کی مبیّنہ فضیلت، عورتوں کی مبیّنہ ناقص العقلی وغیرہ مسلمان مردوں کے بنائے ہوئے ڈھکوسلے ہیں جن کی بنیاد اسلام کی تعلیم پر نہیں بلکہ مردوں کے بنائے ہوئے سماجی مفروضوں پر رکھی گئی ہے:

> ہمارے تمدن کے مختلف اوضاع واطوار محض اس جھوٹے دعوے پر مبنی ہیں کہ مرد حاکم ہیں اور عورتیں محکوم ہیں اور مردوں کے آرام کے لیے پیدا کی گئی ہیں اور اس لیے وہ ان پر تقریباً اسی قسم کے اختیارات رکھتے ہیں جس

طرح وہ ہر قسم کی جائیداد پر رکھتے ہیں اور ان کے حقوق مردوں کے حقوق کے برابر نہیں ہوسکتے۔ اگر اس غلط اور ناپاک اصول کو مرد صرف اپنے تعصّب اور خود پسندی کا نتیجہ سمجھتے اور اس کی تائید میں کسی دلیل کے لانے کا دعویٰ نہ کرتے تو بھی ہم کو صبر آتا۔ لیکن ظلم تو یہ ہے کہ اس جھوٹے دعوے کو انصاف پر مبنی اور عقلی دلائل سے موّید اور مرضیِ الٰہی کے مطابق جانتے ہیں۔ انھی خیالات کی غلطی کو کھول دینا اور ان کی بے ہودگی کو ظاہر کردینا ہماری اس تحریر کا موضوع ہے۔[۲۰]

یہی جذبہ 'تہذیبِ نسواں' کی پسِ پشت تھا اور جن حقوق کی تصریح اور پشت پناہی کتاب میں کی گئی تھی وہ رسالے کے بھی اہم موضوع رہے۔ لیکن یہ بھی ہوا کہ چند حقوق ایسے بھی سامنے آئے جو 'تہذیبِ نسواں' سے قبل اتنے واضح نہ ہو پائے تھے۔ اولین تھا آزادیِ رائے اور اس کے اظہار کا حق۔ اس کا مظاہرہ 'تہذیبِ نسواں' میں برارد یکھنے کو ملتا ہے۔ اختلافِ رائے کے باوجود مضمون کو مضمون نگار کی حسبِ منشا شائع کیا جاتا تھا۔ **ممتاز علی** اپنے اختلاف کا اظہار بھی کرتے لیکن ان کی تحریر سے اگر کوئی اختلاف کرے تو اسے برداشت بھی کرتے تھے۔ اپنی علمیت یا اپنی بزرگی کا اعلان کر کے مخالف کو راندۂ درگاہ نہیں کرتے تھے۔ اخبار کی اس پالیسی کا اثر یقیناً اس میں لکھنے والوں پر پڑا تھا۔ نتیجتاً ہم دیکھتے ہیں کہ بعض معاملات پر متعدد مضامین اختلاف اور تائید میں چھپتے ہیں۔ گرما گرمی بھی ہوتی ہے لیکن ہر ایک کو اظہارِ رائے کا موقع ملتا ہے اور خود **ممتاز علی** اپنی غلطی کا اعتراف کرنے سے نہیں شرماتے۔

دوسرا حق جو عورتوں کو 'تہذیبِ نسواں' نے غیر دانستہ دلوایا وہ تھا حقِ بہناپہ اور میل جول کا۔ شرفا، خواہ مسلمان ہوں یا ہندو، کا قاعدہ تھا کہ ان کے مرد تو دوسرے مردوں سے ملتے جلتے تھے لیکن

خواتین کا ملنا جلنا بہت محدود تھا۔ان کی زندگی میں شاذ ہی کوئی ایسا موقع آتا ہوگا جب وہ خاندان کے باہر کی کسی عورت سے ملتی ہوں۔متوسط طبقے کے گھرانوں کی عورتیں بہت سے بہت اپنی **دیوار بیچ** پڑوسنوں سے بات کر لیتی تھیں۔ جیسے جیسے اس طبقے کے لوگ بڑھتے گئے اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں جا کر عارضی یا مستقل طور پر رہنے لگے،ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ دوسری عورتوں سے تعلقات بنائیں۔اس طرح آپس میں آمد و رفت بھی بڑھی۔ چنانچہ اسی نئی صورتِ حالت کو ہی محسوس کر کے **محمدی بیگم** نے ایک پوری کتاب 'آدابِ ملاقات' لکھی، جو پے در پے کئی بار طبع ہوئی۔ لیکن **محمدی بیگم** اور **ممتاز علی** دونوں کو اس بات کا یقین تھا کہ ان کے طبقے کی خواتین کے ذہن مردوں کی ہدایات سے نہیں بلکہ خود اپنی صنف کی مثال اور تجربہ سے واقف ہو کر ہی کشادہ ہوں گی اور یہ کہ جس طرح کی دوستی کے رشتے مرد بناتے ہیں، اسی طرح کے رشتے بنانے کی خواہش عورتیں بھی محسوس کرتی ہوں گی،اور یہ خواہش نہ صرف ہر طرح مناسب ہے بلکہ ایک طرح کا حق ہے۔

'تہذیبِ نسواں' میں 'بزمِ تہذیب' کا عنوان بنا کر دو تین صفحے ان خطوں کے لیے وقف ہوتے تھے جن میں خواتین مضامین پر اپنی آراء، اپنے شہر یا خاندان کی کوئی خاص خبر، صحت اور خانہ داری کے تعلق سے کوئی سوال، اشیا استعمال جن کے اشتہار رسالے میں شائع ہوتے تھے، پر تبصرہ بغیر کسی تصنع یا تکلف کے شائع کرا سکتی تھیں اور کرواتی تھیں اور چوں کہ یہ عورتیں دوسری عورتوں کو 'بہن' کہہ کر ہی مخاطب کرتی تھیں اس لیے جلد ہی ایک بہنا پہ کا رشتہ 'تہذیبِ نسواں' کی تمام پڑھنے والیوں کے درمیان قائم ہوگیا تھا اور اسی نے آگے چل کر '**انجمن تہذیب**' اور '**لیڈیز کانفرس**' اور '**مسجد فنڈ**' اور کئی اور تحریکوں کے ابھرنے اور پھیلنے میں بڑا کام کیا۔ 'تہذیبِ نسواں' کو جو بے مثال مقبولیت ابتدا کے ۳۰ سالوں میں ملی اس کا بڑا سبب یہی تھا کہ پڑھنے والیوں کو اس کے صفحات میں ایک خاص اپنائیت محسوس ہوتی تھی، اور وہ آپس میں بھی ایک رشتہ کا تصور کر پاتی تھیں۔ جب وہ بات نہ رہی اور خود پڑھنے والیوں کو بھی ایسے 'کاغذی' رشتے بنانے کی حاجت نہ رہی کیوں کہ تعلیم کے بڑھنے اور پردے کے گھٹنے سے ان کا حلقہ ارتباط ویسے بھی پھیلا تھا، 'تہذیبِ نسواں' کی مقبولیت میں بھی زوال آیا ویسے بھی ڈائجسٹوں کی یلغار کے سامنے کسی ماہنامے کا ٹکنا اب ممکن نہ رہا تھا۔

'تہذیبِ نسواں' کے اس قدر موثر بننے اور اس کی پڑھنے والیوں کے اس قدر فعال بننے

میں بڑا دخل اس مثال کا تھا جو **محمدی بیگم** نے قائم کی تھی۔ وہ جو کچھ کرتی تھیں، وہ جو کچھ دیکھتی تھیں، جو بات یا واقعہ ان کو کسی طور سے متحرک کرتا تھا، اس کا ذکر اپنے رسالے میں فوراً کر دیتی تھیں اور اس طرح ایک مکالمے کا آغاز ہو جاتا تھا جس میں حصہ لینے میں خواتین کوئی جھجک نہیں محسوس کرتی تھیں۔ گو بظاہر تہذیبِ نسواں' یا **ممتاز علی** نے کوئی نامزدہ تحریک مستورات کو ان کے حقوق دلانے کی نہیں چلائی، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں نے خواتین میں یہ احساس شدت سے جگا دیا تھا کہ وہ مردوں کے مساوی حقوق رکھتی ہیں اور ان حقوق کے اظہار کا بھی ان کو حق حاصل ہے۔

مجھے یہ کتاب مرتب کرنے کی تحریک کیوں ہوئی؟ ایک محرک تو سامنے کی بات ہے: تہذیبِ نسواں' پچاس سال جاری رہا اور اب اس کو بند ہوئے بھی پچاس سال ہو چکے، تو لازم آتا ہے کہ اس میں شائع شدہ اہم تحریریں جو کہیں اور مہیا نہیں، منتخب کر کے شائع کر دی جائیں تا کہ نئی نسلوں کی دسترس میں پہنچ جائیں۔ لیکن مجھے کچھ اور باتیں بھی اکسا رہی تھیں۔ خوش قسمتی سے میرا لڑکپن اس وقت گزرا جب ابھی **اردو** میں طرح طرح کے ماہنامے شائع ہو رہے تھے۔ ان ماہناموں میں بحیثیت مجموعی تو تنوع ہوتا ہی تھا ساتھ ہی یہ بھی کہ خود ہر سال میں متنوع موضوعات ہوتے تھے، اور ہر شمارے میں بھی وہ یکسانیت نہ ہوتی تھی جو بعد میں ہونے لگی، خاص طور پر جب سے ضخیم سہ ماہی یا سالانہ رسالے شائع ہونے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کی ابتدا سے لے کر اس کے نصف تک جو ماہنامے **اردو** میں شائع ہوتے تھے ان میں سے بیش تر سنجیدہ سوچ کو ہی اپنا طرۂ امتیاز کہتے تھے اور کوئی مقبول اور مقتدر رسالہ محض ادبی یا سیاسی یا معاشرتی نہ ہوتا تھا۔ بیش تر میں حالاتِ حاضرہ کے جائزے کا بھی اہتمام کیا جاتا اور ناظرین کے ردِعمل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا۔ ان رسالوں کے رد میان بھی کسی نہ کسی مسئلے پر بحث چھڑ جاتی تھی جو مہینوں چلتی تھی اور پڑھنے والے اس میں حصہ لیتے تھے۔ الغرض ان ماہناموں کی دنیا ایک پُر لطف گہما گہمی کی دنیا ہوتی تھی۔ آج جب ہفتہ واری رسالے خواب بن چکے اور ماہانہ رسالے نادر، اس گہما گہمی کی یاد تازہ کرنا ضروری ہے۔ اس طرح کے کام میں عظیم پیش رفت ڈاکٹر **عابد رضا بیدار** نے کی تھی جب وہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ) کے ڈائرکٹر تھے اور کوئی درجن بھر اہم رسالوں کے انتخاب مرتب کر کے کئی کئی جلدوں میں شائع کر دیتے تھے۔ خاص طور پر زمانہ (کانپور) کا انتخاب ایک درجن سے زائد جلدوں میں خاص اہتمام سے مختلف موضوعات کے

تحت مہیا کر دیا تھا۔ **دیانارائن نگم** صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والا یہ رسالہ **اردو** کی تاریخ میں کتنا اہم رہا ہے اس کا اندازہ اس انتخاب کو دیکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا محرک ایک احساس تھا جو ممکن ہے بے جا ہو لیکن اس کا اظہار ضروری ہے۔ آج کل کے نوجوان محققین، خواہ مرد ہوں یا عورت، سے تبادلۂ خیال کے وقت مجھے اکثر ایسا لگا ہے کہ انھیں کچھ اندازہ نہیں کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی دہوں میں ہمارے معاشرے کی عورتوں میں کس قدر روشن خیالی، آزادیِ رائے، حوصلہ مندی، خود اعتمادی موجود تھی اور یہ کہ ان خواتین میں تنظیمی صلاحیتوں کا نہ تو فقدان تھا — جس مرد نے کبھی خانہ داری نہ کی ہو وہی ایسا احمقانہ گمان کر سکتا ہے — اور نہ وہ ان صلاحیتوں کا گھر سے باہر اظہار کرنے سے ہی قاصر تھیں۔ ان 'مستورات' کو سیاست سے بھی دلچسپی تھی اور مذہبیات سے بھی۔ ان کی دلچسپیاں انہی باتوں تک نہیں تھیں جن کا ذکر **نذیر احمد** اپنے ناولوں میں کرتے ہیں یا جن کی حد بندی **اشرف علی تھانوی** نے اپنے ہدایت نامے میں کر دی ہے۔ مزید براں، اگر کوئی رسالہ اس زمانے میں مخصوص عورتوں کے لیے شائع ہوتا تھا تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس میں ان مسائل کا تذکرہ نہ ہوتا تھا جو پورے معاشرے سے متعلق تھے۔ یہ تو ہماری، یعنی معاصر محققین کی کم نظری اور کوتاہی ہے کہ ہم انھیں یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی محقق 'عدم تعاون' پر ریسرچ کرے گا تو لازماً اس زمانے کے اخبارات کا بھی جائزہ لے گا۔ چنانچہ اس موضوع پر جو کتابیں میری نظر سے گزری ہیں ان میں ایسا ہی ملتا ہے۔ لیکن ان اخبارات کی فہرست میں مجھے کسی ایسے رسالے کا نام نظر نہیں آیا جس سے یہ اعتماد ہوتا کہ اس معاملے پر عام مردوں کی رائے کو ہی نہیں عام عورتوں کی رائے کو بھی زیرِ غور لایا گیا ہے۔

بالفاظِ دیگر ہمیں اپنے ماضی کا قیاس اپنے حال پر نہ کرنا چاہیے، خاص طور پر جب بات ہماری بڑی بوڑھیوں کی ہو رہی ہو۔

اسی خیال کو معتبر بنانے کا جذبہ اس کتاب کا سب سے بڑا محرک رہا ہے اور جیسے جیسے 'تہذیبِ نسواں' کے شمارے میرے مطالعے میں آتے گئے، یہ جذبہ شدت پکڑتا گیا۔ جو کام آسان سمجھ کر شروع کیا تھا وہ آسان نہ رہا۔ کام پھیلا اور ایسا پھیلا کہ مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ مجوزہ ایک جلد کی جگہ اس انتخاب کو دو جلدوں میں تیار کیا جانا ضروری ہے۔ ایک نسبتاً مختصر جلد ان ادبی نوادرات کی جو کسی بھی

رسالے کا انتخاب تیار کرنے میں لازمی شامل کی جاتی ہیں یعنی نثر و نظم کی وہ تحریریں جن کے خالق آگے چل کر **اردو ادب** کی تاریخ کے نمایاں نام بن گئے، بالخصوص ورنہ تخلیقات جو بعد میں کسی شکل میں شائع نہ ہوئیں یا اگر شائع ہوئیں تو نمایاں نظرِ ثانی کے بعد۔ اور دوسری جلد ترتیب کے اعتبار سے اول، نسبتاً ضخیم اور ان تحریروں پر مشتمل جو یہ واضح کر دیں کہ 'تہذیبِ نسواں' نسوانی رسالہ ضرور تھا لیکن اس لفظ کی توضیح اس کی اپنی تھی۔ وہ نہ تو **سید احمد دہلوی** کے 'اخبار النساء' کے انداز میں بیگماتی تھا اور نہ ان معنی میں نسوانی تھا جو بعد کے مقبول رسالوں مثلاً 'عصمت'، 'بنات'، 'خاتونِ مشرق' اور 'زیب النساء' کی وجہ سے اب اس لفظ 'نسوانی' سے جوڑ دیے گئے ہیں۔

یہی جذبہ مشمولات کا انتخاب کرنے میں بھی پیش پیش رہا ہے۔ 'تہذیبِ نسواں' کے مضمون نگاروں میں مرد بھی ہوتے تھے۔ ان کی تعداد کو دال میں نمک نہیں سمجھنا چاہیے، اگرچہ اکثریت خواتین ہی کی ہوتی تھی۔ میں نے انتخاب کرتے وقت خواتین کی نمائندگی کو ترجیح دی ہے۔ اس ترجیح کا اظہار خاص طور پر اس موقع پر ہوا ہے جب کسی ایک متنازع موضوع پر چند مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ میرا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہ بات سامنے آجائے کہ ہماری بزرگ خواتین سنجیدہ موضوعات کو اٹھانے اور ان پر سنجیدہ بحث کرنے میں اپنے ہم عصر مردوں سے پیچھے نہ تھیں۔ اور یہ کہ آج سے سوا سو سال پیش تر کے سماجی مسئلوں پر اگر ہم صرف **حالی**، **شبلی**، **حسن نظامی** اور **اکبر** وغیرہ کی رائیں تلاش کرتے ہیں تو یہ ہماری خطا ہے کیوں کہ اسی زمانے میں **محمدی بیگم**، **اشرف النساء بیگم**، **امت الحمید**، **بنت نذر الباقر** اور **مسز برلاس** وغیرہ سبھی ایسی ہی سنجیدہ بحثوں میں حصہ لے رہی تھیں۔ چنانچہ عام مضامین کے علاوہ میں نے یہ ضروری سمجھا کہ مسائل اور موضوعات کا انتخاب اس طور پر بھی کیا جائے کہ خود 'تہذیبِ نسواں' کی پڑھنے والیوں کی ترجیحات بھی سامنے آجائیں۔ مثلاً یہی بحث کہ خواتین اپنا نام 'تہذیبِ نسواں' کے صفحات پر کس طرح ظاہر کریں۔ اسی سلسلے میں میرے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ یہ بھی واضح ہو جائے کہ **سید ممتاز علی** ان بحثوں کی ہمت افزائی کرتے تھے اور اپنی رائے کو خواتین پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ بارہا ایسا ہوتا تھا کہ مرسلہ مضمون ان کی رائے کے خلاف ہوتا تھا لیکن اسے اسی طرح شائع کر دیا جاتا تھا، جیسا کہ اس بحث میں دیکھا جا سکتا ہے جو 'تہذیبِ نسواں' میں مسئلہ ارتداد پر کچھ عرصے کے لیے چھڑی تھی، اور جس میں ایک غیر مسلم خاتون نے بھی حصہ لیا تھا۔ **ممتاز علی** چاہتے تھے کہ رسالے کے صفحات پر بحثیں چھڑیں اور

'تہذیبی بہنیں' آزادی سے اس میں حصہ لیں اور اپنی رائے آزادی سے ظاہر کرنے کا حق اسی طرح استعمال کریں جس طرح وہ خود کر کے ایک مثال قائم کرتے تھے۔

یہ کتاب بنیادی طور پر ایک انتخاب ہے ان تحریروں کا جو اپنے وقت کے مقبول ترین 'نسوانی رسالے تہذیبِ نسواں' میں سے، چند مقاصد اور اصول کے تحت یہاں جمع کر دی گئی ہیں۔ چنانچہ اس کی مشمولات میں صرف دو مضمون ایسے ہیں جو تہذیبِ نسواں' میں نہیں شائع ہوئے تھے۔ ایک **شیخ محمد اسماعیل پانی پتی** کا، **سید امتیاز علی** پر اور دوسرا مرتب کا، **محمدی بیگم صاحبہ** پر۔ دونوں شامل کرنے ضروری سمجھے گئے تاکہ ان سے تہذیبِ نسواں' کے دونوں خالقوں کی سوانح اور تصنیفات پڑھنے والوں کے سامنے پوری تفصیل سے آجائیں۔ کتابِ ہذا کی دونوں جلدوں کے باقی مضامین تہذیبِ نسواں' کے شماروں سے ہی نقل کیے گئے ہیں۔ مضمون نگار کا نام اسی شکل میں درج ہے جس طرح اصلاً شائع ہوا تھا۔ البتہ یہاں مضمون کی ابتدا میں درج کیا گیا ہے جب کہ رسالے میں مدتوں مضمون نگار کا نام مضمون کے آخر میں درج ہوتا تھا۔ نام کے ساتھ مضمون نگار کے شہر کا نام بھی دیا گیا ہے۔ ہر مضمون کے آخر میں اس کی تاریخِ اشاعت بھی درج کر دی گئی ہے۔ تہذیبِ نسواں' میں **ممتاز علی** نے اوقاف کا ایک طریقہ استعمال کیا تھا جو اس وقت اجنبی تھا لیکن بہت ضروری بھی۔ یہاں وہ طریقہ چھوڑ کر آج کے مروّج طریقے سے ہی جملے، فقرے اور پیراگراف ظاہر کیے گئے ہیں۔

جلد اول میں مشمولات کی ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے: اول **سید ممتاز علی** اور **محمدی بیگم** پر تحریریں جو ان کی وفات کے بعد بالترتیب تہذیبِ نسواں' میں شائع ہوئی تھیں۔ **محمدی بیگم** پر تحریریں نسبتاً کم ہیں البتہ ان کی یاد ان کی تہذیبی بہنوں میں عرصے تک زندہ رہی تھی اور اس کا اظہار ہر سال رسالے کی سالگرہ کے موقع پر شائع ہونے والی نثری اور منظوم تحریروں میں کسی طور ضروری ہوتا تھا۔ اس کے بعد خود تہذیبِ نسواں' سے متعلق مضامین، جن میں سب سے اہم وہ مضمون ہے جو **سید صاحب** نے ۱۹۱۸ء میں لکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک مختصر انتخاب ان تحریروں کا ہے جن میں رسالے کی 'ترقی' کے سلسلے میں مختلف تجاویز پر بحثیں چھڑی تھیں۔ ان سے ہمارے سامنے وہ مقاصد آجاتے ہیں جو **ممتاز علی** کے ذہن میں تھے اور وہ بھی جو رسالے کی قارئین خواتین اپنے رسالے کے لیے مناسب سمجھتی تھیں۔

تہذیبِ نسواں' کے ابتدائی دو دہوں کے شمارے پڑھتے وقت یہ واضح احساس ہوتا ہے

کہ ہماری ان بزرگوں میں منظّم ہونے اور کچھ کرنے کا جذبہ خاصی شدت سے تھا، چنانچہ اپنے پسندیدہ رسالے کے صفحات پر وہ برابر مختلف طرح کے کاموں کی تجاویز پیش کرتی تھیں۔ اس سلسلے میں خود **محمدی بیگم** پیش پیش تھیں اور انھوں نے خود لاہور میں خاصا کچھ کر کے دکھایا تھا۔

چوتھے سیکشن میں 'تحریکیں اور تجاویز' کے عنوان کے تحت اس نوعیت کے چنیدہ مضامین اگلے سیکشن میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ ان میں سے کسے کیا کامیابی حاصل ہوئی، اس کا کچھ اندازہ 'بزمِ تہذیب' کے تحت شائع ہونے والے مراسلات سے ہوسکتا ہے لیکن ان کا انتخاب یہاں شامل کرنا ممکن نہ تھا۔ البتہ ایک تجویز سب سے زیادہ دور رس ثابت ہوئی جو **حامدہ دہلوی صاحبہ** نے ۱۹۰۷ء میں پیش کی تھی جسے **محمدی بیگم** نے 'تہذیبی مجمع' کا نام دے کر شائع کیا تھا اور اس کی تائید بھی کی تھی۔ اتفاق سے اسی سال ایک اور خاتون نے زنانہ کلب شروع کرنے کی تجویز بھی پیش کی تھی۔ زنانہ کلب تو نہ قائم ہو سکے لیکن 'تہذیبِ نسواں' کے قارئین نے انفرادی طور پر جو بہنا پا محسوس کرنا شروع کر دیا تھا اس کا اظہار آگے چل کر تہذیبی انجمنوں کے قیام میں متشکل ہوا۔ ان انجمنوں کے جلسوں کی رپورٹیں بھی 'تہذیبِ نسواں' میں شائع کی جاتی تھیں۔ چنانچہ پانچویں سیکشن میں 'انجمن تہذیبِ نسواں' سے متعلق مضامین اور رپورٹوں کا ایک انتخاب جمع کر دیا گیا ہے۔ غالباً **اردو** کی تاریخ میں 'تہذیبِ نسواں' واحد رسالہ ہے جسے اس کے قارئین نے اس طرح اپنی شناخت کا جزو بنایا اور پھر اس شناخت کو ایک تنظیم میں ڈھالنے کی کوشش بھی کی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے صرف اتنا ہی سوچنا کافی ہے کہ کیا یہ خواتین اس سے قبل محض مشترک خیالات کی بنا پر ایک دوسرے سے ملتی تھیں؟ اگر ہم اس سوال پر غور کریں تو ہم پر یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ **محمدی بیگم** نے رسموں کی ایک انوکھی کتاب 'آدابِ ملاقات' کیوں تصنیف کی ہوگی اور کیوں اس کتاب کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ بار بار شائع کی گئی۔

ان تہذیبی انجمنوں کی بنیاد دراصل اسی دن پڑ گئی جب 'تہذیبِ نسواں' میں چند صفحات پابندی سے قارئین کے مراسلات کے لیے وقف کر دیے گئے۔ چوں کہ ابھی تک ابتدائی سالوں کی مکمل فائلیں دستیاب نہیں ہوئیں۔ (یا کم از کم میری رسائی ان تک نہیں ہوئی) اس لیے یہ تحقیق سے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ مستقل سیکشن، جسے عموماً 'محفلِ تہذیب' کا عنوان دیا گیا، کب شروع ہوا تھا۔ اہم ترین

پہلواس کا یہ ہے کہ اس میں صرف ایڈیٹر کے نام لکھے گئے خط نہیں ہوتے تھے بلکہ اکثر پڑھنے والیاں اسی کے ذریعہ ایک دوسرے سے رابطہ بھی قائم کرتی تھیں اور عام دلچسپی کی مقامی یا ذاتی خبریں بھی شائع کرواتی تھیں۔ میرے خیال میں **اردو** کی تاریخ میں یہ اولین ذریعہ تھا جس نے ایک دوسرے سے بہت دور رہنے والیوں میں بھی بہنا پا پیدا کروادیا تھا۔ اگر دور دور بسنے والے ہم خیال مردوں میں رابطہ انجمنوں اور کانفرنسوں کے ذریعہ پیدا ہوا تھا تو وہی کردار 'تہذیبِ نسواں' کے اس مستقل کالم نے عورتوں کے تعلق سے ادا کیا تھا۔ چنانچہ یہاں بھی کئی صفحات اس کالم کا انتخاب پیش کرنے کے لیے وقف کیے گئے ہیں۔ یہاں اس تاثر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ جس جذبہ یا للک اور اپنائیت کی جھلک ان خطوط میں ملتی ہے وہ مجھے عام (یعنی مردانہ) اخباروں کے مراسلات کے کالموں میں کہیں نہیں نظر آئی ہے۔ نہ اس زمانے کے رسائل میں اور نہ آج کے جریدوں میں۔ رہی بات دوسرے 'نسوانی' رسائل کی تو ان کے بارے میں وثوق سے کہنا میرے لیے ممکن نہیں۔

اس کتاب میں غیر ادبی مضامین اور ادبی نثری یا منظوم تحریروں کو دو جگہ جمع کیا گیا ہے۔ پہلی جلد میں وہ مضامین ہیں جو 'تہذیبِ نسواں' کو بحیثیت ایک سماجی تحریک کے نمایاں کرتے ہیں۔ جن سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کن موضوعات پر اس رسالے نے خواتین میں علمی تجسس اور تفکر پیدا کرنے کی خاص کوشش کی اور اس میں کس قدر کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ ساتھ ہی یہ بھی نمایاں ہو جائے کہ اس کی قارئین نے خود بھی کن مسائل کو تبادلۂ خیال کے لیے چُنا اور آزادی سے ان پر اظہارِ رائے کیا۔ دوسری جلد میں زیادہ تر وہ تحریریں ہیں جن کو مروجہ معنی میں ادبی کہا جاتا ہے، یعنی **افسانے، ڈرامے، منظومات** ساتھ میں **سفرنامے** اور **ذاتی یادداشتیں** بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ دونوں جلدوں کے مشمولات 'تہذیبِ نسواں' کے پہلے تیس سالوں کے شماروں سے ہی اخذ کیے گئے ہیں۔ دوسری جلد میں خاص اہتمام ایسی تحریروں کا کیا گیا ہے جنھیں ادبی نوادر بھی کہا جا سکتا ہے یعنی ان ادیبوں کی ابتدائی تحریریں جو آگے چل کر **اردو** کی ادبی تاریخ کے بڑے نام بنے، مثلاً **نذر سجاد حیدر، حجاب امتیاز علی** اور **پطرس** **اردو** کی مایہ ناز ناولسٹ اور **افسانہ نگار، قرۃ العین حیدر** کی بھی بعض دلچسپ تحریریں 'تہذیبِ نسواں' میں ملیں گی، گو ان کی اولین تحریر غالباً 'پھول' میں شائع ہوئی تھی۔ ان کے بارے میں ایک اہم اطلاع بھی اتفاق سے 'تہذیبِ نسواں' کے ایک شمارے میں ملی۔ ۱۹/اکتوبر ۱۹۲۶ء کے شمارے کے ایک مضمون

میں ان کی والدہ نے ان کا ذکر کیا ہے جس کی بنا پر ہم ان کا سنہ پیدایش ۱۹۲۵ء یا اس سے قبل رکھ سکتے ہیں۔ اتنی ہی اہم میرے لیے ان کی ہم نام ایک خاتون کی دریافت تھی جن کی متنوع تخلیقات رسالے کی اولین دہائیوں میں پابندی سے شائع ہوتی تھیں۔ ان کا اصلی نام **فاطمہ بائی** تھا، **قرۃ العین** ان کی اختیار کردہ عرفیت تھی۔ میسور وطن تھا۔ ایک موقع پر **امتیاز علی تاج** ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

محترمه قرة العين كو 'تهذيب' كا افسانه نگار كهنا
چاهيے۔ انهوں نے اگر چه طبع زاد افسانے نهيں
لكهے بلكه دوسری زبانوں كے افسانوں كو هی
اردو كا لباس پهنايا هے ليكن ان كے ترجموں كی
ايك خصوصيت يه هے كه اصل كی خصوصيت
ترجمے میں بهت حد تك قائم رهتی هے اور اندازِ
بيان میں پيچيدگی بهی نهيں آتی۔ [۲۱]

انھوں نے کہانیوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر مضامین بھی ترجمہ کیے تھے۔ افسوس کہ ان کے تمام تراجم کتابی شکل میں لوگوں تک نہیں پہنچے۔ میرا، اندازہ ہے کہ بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں ان کی ترجمہ کی ہوئی مختلف اصناف کی تحریروں کی تعداد ۵۰ سے اوپر رہی ہوگی۔

دوسری جلد میں دو نامور اہلِ قلم کی نادر تحریریں شامل کرتے ہوئے مجھے خاص خوشی ہوئی۔ **حجاب صاحبہ** ابتدا میں **حجاب اسماعیل** اور شادی کے بعد **حجاب امتیاز علی** کے نام سے مشہور ہوئیں۔ انھوں نے غالباً سب سے پہلے 'تهذيبِ نسواں' ہی میں اپنی تحریریں اشاعت کے لیے بھیجیں اور یہ لازم بھی تھا۔ ان کی والدہ **عباسی بیگم صاحبہ** بھی 'تهذيبِ نسواں' میں ہی اشاعت کو ترجیح دیتی تھیں۔ **امتیاز علی** سے شادی کے بعد تو وہ 'تهذيبِ نسواں' کے بنا گزار خاندان کی ایک ممبر بن گئی تھیں۔ 'تهذيبِ نسواں' میں ان کی شائع شدہ نثری نظموں، افسانوں اور مختلف موضوعات پر مضامین کی تعداد کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے خاصی تحریریں ایسی ہوں گی جو بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوئیں، لیکن خاصی تعداد ان کی بھی ہوگی جو 'تهذيبِ نسواں' ہی میں محفوظ رہ گئیں۔ مزید براں جو تحریریں کتابی شکل میں دوبارہ شائع ہوئیں ان میں بھی **محترمہ** نے اضافے اور تبدیلیاں کیں۔ مثلاً ایک

کہانی "کییابوت کے آسیب زدہ جنگل"

یہ کہانی اسی نام سے پہلے تہذیبِ نسواں ' میں کئی قسطوں میں ۱۹۳۷ء کے اواخر میں شائع ہوئی تھی (۴ر ستمبر تا ۹ر اکتوبر ۱۹۳۷ء) آٹھ سال بعد **محترمہ** کی یہ کہانی مجموعہ ممی خانہ اور دوسرے هیبت ناك افسانے (لاهور ۱۹۴۵ء) میں بھی شامل کی گئی، لیکن نظرِ ثانی کے بعد نقشِ اول اور نقشِ ثانی میں کیا فرق ہے اس کا مکمل جائزہ لینا یہاں ممکن نہیں اور نہ میرے مقصد کے لیے ضروری ہے۔ صرف ایک مثال سے ہی کچھ اندازہ ہو جائے گا کہ **حجاب امتیاز علی** کس طرح اپنی تحریر کو مزید اثر انگیز اور رواں بنانے کی سعی کرتی ہیں۔ انھوں نے کہانی کے بیانیہ کو گمنام بیان کرنے والی 'میں' کی ڈائری کی شکل میں ترتیب دیا ہے۔ اس کا پہلا اقتباس ہی نیچے اپنے دونوں روپوں میں درج کیا جا رہا ہے:

پہلا روپ ۱۹۳۷ء

۲ر مارچ ۱۹۳۷ء

ہمارا جہاز صنوبری روز بروز خاک کے ساحلوں سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔

بوڑھے **ڈاکٹر گار** کو اجنبیوں سے راہ و رسم پیدا کرنے میں کمال حاصل ہے۔ آج دوپہر سخت گرمی تھی۔ میں عرشۂ جہاز پر نکل آئی۔ ایک ڈک چیئر پر بیٹھی اپنے ایک نامکمل ناول کا مسودہ دیکھ رہی تھی۔ اور سبز موجوں کی موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھی، کہ وہ **کپتان افراطی** کو میری ملاقات کے لیے لے آیا۔ **کپتان افراطی** مشہور سیاح اور شکاری ہیں۔ حال ہی میں ان کی ایک ضخیم کتاب مع تصاویر کے درندوں کی زندگی ' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ میں نے نہایت شوق سے ان سے ملاقات کی اور ان کے سفر کے حالات پوچھے۔ نہایت دلچسپ آدمی ہیں، اور کئی خوفناک سفر کر چکے ہیں۔

دوسرا روپ ۱۹۴۵ء

۲۳ر مارچ ۱۹۴۵ء

(ہمارا جہاز) **ریحانیہ** روز بروز روحناك کے ساحلوں کے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ خدا کرے وہ دن جلد آئے جب میں وطن پہنچوں۔ گو اعصاب سخت متاثر ہیں تاہم اس سمندری سفر نے مجھے بڑا فائدہ پہنچایا ہے۔

بوڑھے **ڈاکٹر گار** کو اجنبیوں سے راہ و رسم پیدا کرنے میں کمال حاصل ہے۔ میں اس فن سے

قطعی لاعلم ہوں۔ آج دوپہر سخت گرمی تھی اور ہوا بالکل بند تھی۔ اس لیے میں عرشۂ جہاز پر نکل آئی۔

ایک ڈک چیئر پر بیٹھی اپنے ایک نامکمل ناول کا مسودہ دیکھ رہی اور سبز موجوں کی موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ **ڈاکٹر گار** ایک اجنبی کو لیے میرے پاس آ گیا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب اس نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ **کپتان افراطی** ہیں۔ مشہور سیاح اور ماہر شکاری۔ حال ہی میں ان کی ایک ضخیم کتاب مع تصاویر کے 'درندوں کی زندگی' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ میں نے نہایت شوق سے ان سے ملاقات کی اور ان کے سفر کے حالات پوچھے۔ نہایت دلچسپ آدمی ہیں۔ اور کئی خوفناک سفر کر چکے ہیں۔

دوسری اتنی ہی اہم دریافت اور ہماری ادبی تاریخ میں اہم اضافہ **پطرس** کے وہ مضامین ہیں جو ایک زمانے میں 'تہذیبِ نسواں' میں شائع ہوئے لیکن دوبارہ کتابی شکل میں کبھی شائع نہیں ہو پائے۔ ان میں سے کچھ ممکن ہے **تاج صاحب** کی فرمائش پر لکھے گئے ہوں، لیکن بعض کی تحریک خود ان کے ذہن نے کی ہوگی۔ مثلاً خُلع کے موضوع پر ایک طویل مضمون یا ایک دلچسپ **فکاہیہ** تحریر خود 'تہذیبِ نسواں' کے بارے میں۔ ان فراموش شدہ تحریروں سے **پطرس** کے فن اور فکر کے متعلق ہماری واقفیت میں خاصا اضافہ ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ **پطرس**، **حجاب امتیاز علی**، **غلام عباس**، **نذر سجاد** اور **احمد ندیم قاسمی** کے بارے میں لکھتے وقت شاید ہی کسی نے ان کی ان تحریروں پر توجہ کی ہے جو 'تہذیبِ نسواں' اور 'پھول' میں شائع ہو کر رہ گئی ہیں۔

سید ممتاز علی کے اشاعتی ادارے، دار الاشاعت پنجاب (لاہور) نے جو ساکھ حاصل کر لی تھی اس کے نتیجے میں ہر اہلِ قلم خوشی سے اس سے تعاون کرتا تھا۔ **منشی محبوب عالم** کے ادارے، خادم التعلیم پریس (لاہور) کی طرح دار الاشاعت پنجاب کا بھی ایک خاص سررشتہ ترجمہ کرنے والوں کا تھا جس کے تعاون سے یہ مکتبہ مقبولِ عام فکشن کے تراجم بکثرت شائع کرتا تھا۔ اس سیکشن میں اس زمانے کے اُبھرتے ہوئے ادیبوں میں سے متعدد نے کچھ نہ کچھ وقت ضرور گزارا تھا، اور تراجم تیار کر کے نہ صرف روزی کمائی تھی ساتھ ہی فکشن نگاری کا فن بھی سیکھا تھا۔ افسوس کہ ابھی تک ان دو اہم ترین مطابع کی سرگرمیوں کے بارے میں کوئی تحقیقی کام اس نوعیت کا سامنے نہیں آیا۔ جیسا کہ نول کشول پریس کے بارے میں انگریزی میں شائع ہو چکا ہے۔

تہذیبِ نسواں ' کے مستقل کالموں (محفلِ تہذیب، خبریں اور نوٹ، ولایتی معلومات) کے کچھ منتخب اقتباسات دوسری جلد میں درج کیے گئے ہیں۔ اسی طرح رسالے کے ابتدائی دور میں شائع ہونے والے اشتہارات کے کچھ نمونے بھی شامل کر دیے گئے ہیں جو اس وقت کی ترجیحات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ 'محفلِ تہذیب' میں اکثر ان مشتہر چیزوں پر بھی مراسلات شائع ہوتے تھے جو خاصے دلچسپ ہوتے تھے، کیوں کہ خود یہ اشتہار بھی اس وقت ایک بالکل نئی چیز تھی۔ بحیثیت مجموعی' محفلِ تہذیب' کے مراسلات، میرے نزدیک بہت اہم معلومات کے حامل ہیں اور ان کی مدد سے بیسویں صدی کے ابتدائی دہوں میں 'شریف' گھرانوں کی خواتین کی دلچسپیوں، الجھنوں، ترجیحات و مشاغل وغیرہ کے متعلق ہم بہت کچھ جان سکتے ہیں۔

آخر میں لازم آتا ہے کہ ان کا شکریہ ادا کیا جائے جن کے بغیر یہ کتاب مکمل ہونا تو درکنار اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سرِ فہرست نام ہے برٹش لائبریری کا جس کے تحت ایک عظیم الشان پراجکٹ، انڈینجرڈ آرکائیوز پروگرام کے نام سے پرانے جرایدکو ڈیجیٹائز کر کے محفوظ کر لینے کا چل رہا ہے اور جس میں ہماری خوش قسمتی سے من جملہ دیگر زبانوں کے اردو بھی شامل کر لی گئی ہے۔[۲۲] چنانچہ اب ہم گھر بیٹھے دلگداز ' مخزن ' عصمت ' زمانہ ' نیرنگِ خیال ' عالمگیر ' ساقی وغیرہ جیسے اہم لیکن فراموش کردہ پرانے رسائل کی فائلیں پڑھ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ عظیم پروگرام بھی بنیادی طور پر ان کا دستِ نگر ہے جنھوں نے پرانے رسائل اپنے ذاتی یا پبلک ذخائر میں محفوظ کر رکھے تھے۔ چنانچہ تہذیبِ نسواں ' کی پرانی فائلوں تک میری رسائی صرف اس لیے ممکن ہو سکی کہ اس کا ایک بڑا ذخیرہ گجرانوالہ (پاکستان) کے **ضیاءالدین کھوکھر صاحب** نے نہ صرف سالوں کی توجہ اور کوشش سے جمع کر کے محفوظ کر لیا، اور بڑی بات یہ کہ اسے عام پبلک تک پہنچانے کا جب موقع آیا تو بلا تامل اپنی لائبریری کے شیلف کھول دیے۔ **کھوکھر صاحب** کی لائبریری ایک بیش بہا ورثہ ہے جسے اگلی نسلوں کے لیے محفوظ کرنا پاکستان کے محبانِ **اردو** کا اولین فریضہ ہے۔ میرے تیسرے مہربان میرے نوجوان دوست دہلی کے **عبدالرشید** ہیں جو بیک وقت تین چار کاموں میں مصروف رہنے کے باوجود ہمہ وقت میرا کام کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ رسالے پڑھ کر ایک انتخاب تیار کرنا تو آسان کام ہے، منتخب تحریروں کی کتابت اور پروف ریڈنگ کا دردِ سر خوشی خوشی برداشت کرنا اتنا

آسان نہیں کتاب کی ضخامت بھی انہی کی ہمت افزائی کا ثمرہ ہے۔ میں ان کا اور ان کے بھائیوں کا جو اس کتاب کے پبلشر ہیں، از حد ممنون ہوں۔ ان بھائیوں نے میرا کام اتنا آسان نہ کر دیا ہوتا تو یہ کتاب ایک منصوبہ ہی رہتی۔ خدا، ان کو خوش رکھے۔

حواشی

۱۔ توبۃ النصوح —**نذیر احمد** (مکتبہ جامعہ [نئی دھلی] ۲۰۰۱ء) ص:۱۹۵-۱۹۴

۲۔ 'نذیر احمد کا انعامی ادب' —**چودھری محمد نعیم**، مشمولہ: تحفۃ السرور / مرتبہ: **شمس الرحمٰن فاروقی** (مکتبہ جامعہ [نئی دھلی] ۱۹۸۵ء) ص:۵۳-۳۷

۳۔ حیاتِ جاوید —**الطاف حسین حالی** (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان [نئی دھلی] ۱۹۷۹ء) ص:۳۳۶

۴۔ 'خواتین کے اخبارات اور رسائل: پہلا تاریخی وتحقیقی جائزہ' —**نسیم آرا**، مشمولہ: جریدہ، نمبر:۳۵ (غیر مطبوعہ کتابیں نمبر) ۲۰۰۶ء، ص:۱۲۵۵-۱۱۹۲۔ افسوس کہ یہ اہم تحریر طباعت کی اغلاط سے خالی نہیں۔ ضروری ہے کہ اسے پوری صحت کے ساتھ کتابی شکل میں دوبارہ شائع کیا جائے۔

۵۔ ملاحظہ ہو مضمون 'ریاست حیدرآباد اور معلم نسواں' مشمولہ: دلگداز (لکھنؤ) اگست ۱۹۰۰ء، ص:۱۲-۸۔ مضمون نگار کا نام **'ایک پردہ دار'** درج کیا گیا ہے۔ گمانِ غالب یہی ہے کہ مصنف خود رسالہ کے مدیر، **عبدالحلیم شرر** تھے۔

۶۔ J. M. Thoburn, Life of Isabella Thoburn (Chicago: Jennings and Pye, 1902), Passim

۷۔ تاریخ صحافتِ اردو —**امداد صابری** [جلد سوم] (دھلی، مصنف:۱۹۶۳ء) ص:۳۵۳

۸۔ 'تہذیبِ نسواں' —**سید ممتاز علی**، مشمولہ: تہذیبِ نسواں (۶/جولائی ۱۹۱۸ء) ص:۴۳۰

۹۔ رفیقِ عروس —**محمدی بیگم** (دار الاشاعت پنجاب [لاہور] ۱۹۰۶ء طبع چہارم) ص:۱۵۵

۱۰۔ حقوقِ نسواں —**سید ممتاز علی** (دار الاشاعت، پنجاب [لاہور] ۱۸۹۸ء) ص:۵۸

۱۱۔ ایضاً، ص:۵۹

۱۲۔ 'دو اعلیٰ صفتیں' —**سید ممتاز علی**، تہذیبِ نسواں (۶/جولائی ۱۹۱۲ء) ص:۳۳۶-۳۳۵۔ اس مضمون میں تہذیبی بہنوں کو دو صفات پیدا کرنے کی تاکید کی گئی تھی: **'پبلک ملامت'** کا بے خوفی سے

مقابلہ کرنا اور اپنے صحیح مقصد کے حصول کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار رہنا۔

۱۳۔ تہذیبِ نسواں —**سید ممتاز علی**، ص:۴۲۶

۱۴۔ ایضاً، بعض حضرات مخالفین میں **اکبرالہ آبادی** کا نام بھی شامل کردیتے ہیں۔ میرے علم کے مطابق **اکبر** نے رسالے کی مخالفت کبھی نہیں کی۔ تعلیمِ نسواں کے وہ ضرور مخالف رہے تھے لیکن صرف شروع میں۔ بعد میں اس سے بھی تائب ہوگئے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک خط بھی تہذیبِ نسواں ' کو لکھا تھا جو اس کتاب میں شامل ہے۔ خط میں وہ نظم بھی ہے جو اکبر نے ۱۹۱۳ء میں ایک ہندو بزرگ کی فرمایش پر تعلیمِ نسواں کی حمایت میں لکھی تھی۔ **شیخ عبدالقادر** اور ان کے جریدہ مخزن ' نے کیا مخالفت کی تھی اس کا پتا نہ چل سکا۔

۱۵۔ ایضاً، ص:۴۳۰

۱۶۔ 'مسئلہ تقدیر وتدبیر'، مشمولہ: تہذیبِ نسواں (۷رجنوری ۱۹۰۵ء) ص:۷۰۸

۱۷۔ 'مسئلہ تقدیر وتدبیر'، مشمولہ: تہذیبِ نسواں (۱۱رفروری ۱۹۰۵ء) ص:۴۱

۱۸۔ حقوقِ نسواں —**سید ممتاز علی**، ص:۵۶۔ یہیں انھوں نے دو متعلقہ عزائم کا بھی ذکر کیا تھا: "اس اخبار کی ایڈیٹر میرے اپنے خاندان کی کوئی لڑکی ہوگی اور اس اخبار میں کوئی مضمون کسی مرد کا لکھا ہوا درج نہ ہوا کرے گا۔" پہلے عزم میں تو انھیں کامیابی ہوئی اور خود ان کی اہلیہ نے اس بڑی ذمہ داری کا پورا بوجھ اٹھالیا۔ دوسرا عزم لیکن ایک خواب ہی رہا۔ ابتدائی سالوں میں تو صفحات پُر کرنے کے لیے خود **سید صاحب** کو طرح طرح کے بے شمار مضامین لکھنے پڑے تھے۔

۱۹۔ 'تہذیب نسواں'—**سید ممتاز علی**، مشمولہ: تہذیبِ نسواں (۶رجولائی ۱۹۱۸ء) ص:۴۲۹

۲۰۔ حقوقِ نسواں —**سید ممتاز علی**، ص:۴۱

۲۱۔ 'تہذیبی انعامات' مشمولہ: تہذیبِ نسواں —**امتیاز علی تاج** (۲رجنوری ۱۹۳۲ء) ص:۸

۲۲۔ Endangered Archives Program of the British Library. (1) Link for the Urdu libraries they have scanned: https//:eap.bl.uk/project/EAP566/search. Link of for the Tahzib-e- Niswan files: htt's//:eap.bl.uk/collection/EaP566-2-1.

(بشکریہ: تہذیبِ نسواں: ایک جریدہ، ایک تحریک)

’شہاب نامہ‘ کی حقیقت

مرزا حامد بیگ

معروف افسانہ نگار **قدرت اللہ شہاب** (آئی سی ایس) کی خود نوشت ’شہاب نامہ‘ ایک ایسی کتاب ہے، جسے مصنف نے بہت سے حقائق کو چھپانے اور حقیقتِ احوال کو مسخ کرنے کی نیت سے لکھا۔

قدرت اللہ شہاب کو جہاں بطور سینیر بیوروکریٹ، **جنرل محمد ایوب خاں** کے مارشل لاء (اکتوبر ۱۹۵۸ء) کے بعد سرزمینِ پاکستان کے سیاہ و سفید کا مالک شمار کیا گیا، وہیں **ایوب خان** کی غلط پالیسیوں کے ذمہ دار بھی **شہاب** ہی قرار پائے اور ان کے حلقہ احباب میں ضرورت محسوس کی گئی کہ **شہاب** کو ایک برگزیدہ صوفی ثابت کر دیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے **ممتاز مفتی**، **اشفاق احمد** اور **بانو قدسیہ** نے زبان اور قلم کا سارا زور صرف کر دیا۔

ممتاز مفتی، **اشفاق احمد** اور **بانو قدسیہ** کو یہ کھیکھن کھیلنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا

جواب کچھ اتنا آسان نہیں۔ اختصار کے ساتھ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ستّر کی دہائی میں **ذوالفقار علی بھٹو** کے وفاقی سیکرٹری تعلیم کے عہدے سے از خود مستعفی ہو جانے کے بعد جب **ممتاز مفتی**، **بانو قدسیہ** اور **اشفاق احمد** کی جانب سے انتہائی کم گو، از حد مردم بیزار اور نہایت غیر متاثر کن شخصیت کے مالک **قدرت اللہ شہاب** کو **ولی اللہ** ثابت کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں تو پاکستان کے خواص و عوام کا ایک بڑا طبقہ **قدرت اللہ شہاب** کو سی آئی اے کا ایجنٹ اور 'پاپی بیوروکریٹ' کہہ رہا تھا۔ پھر یہی کچھ اس وقت دوہرایا گیا، جب **قدرت اللہ شہاب** کی وفات کے بعد جولائی ۱۹۸۷ء میں 'شہاب نامہ' کی اشاعت عمل میں آئی۔

درحقیقت اصل **شہاب**، جو **اردو** کے لازوال ناولٹ: 'یا خدا' کا خالق بھی تھا، **قدرت اللہ شہاب**، کا ضمیر تھا، اسے بیوروکریسی کی ہمہ وقت طویل اُٹھک بیٹھک سے پیدا شدہ *Habituation* کی نفسیات نے مار کر رکھ دیا۔

قدرت اللہ شہاب کے 'ضمیر کے اس قتل' کا سراغ لگانے کے لیے ذرا پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے۔ اصل نام: **قدرت اللہ**۔ ۲۶ر فروری ۱۹۱۷ء بہ مقام **گلگت** **محمد عبداللہ علیگ** کے گھر جنم لیا۔ والدہ کا نام **کریمہ بی بی** تھا۔ **قدرت اللہ** کے والد ریاست جموں و کشمیر میں ملازمت کے دوران اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ بعد ازآں مہتر **چترال** کے دربار میں نمایاں عہدہ ملا اور **گلگت** کے گورنر بنے۔ **قدرت اللہ** نے ابتدائی تعلیم چترال اور گلگت کے اسکولوں میں پائی۔ طاعون کی وبا پھیلی تو اُنھیں چمکور ضلع انباله بھجوا دیا گیا۔ یوں بابا اجیت سنگھ خالصه هائی اسکول چمکور سے میٹرک کرنے کے بعد پرنس آف ویلز کالج، جموں سے (**ایف ایس سی**) اور (**بی ایس سی**) کے امتحانات پاس کیے۔ دورانِ تعلیم **مہاراجہ ہری سنگھ** نے وظیفہ مقرر کر رکھا تھا۔ **بی ایس سی** کرنے کے بعد **قدرت اللہ** نے بطور شاعر اپنی پہچان چاہی تو پہلے **'رونق'** تخلص اختیار کیا اور اس کے بعد **'جعفر'**۔ بعد ازآں **قدرت اللہ شہاب** ہوئے، لیکن شعر گوئی سے نبھی نہیں، لہٰذا افسانہ طرازی اختیار کی۔ پہلا افسانہ بہ عنوان 'چندراوتی'، **اختر شیرانی** کے مجلّہ 'رومان' لاہور ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ 'شہاب نامہ' کے چھٹے باب میں 'چندراوتی' کی شمولیت نے ثابت کیا کہ یہ تحریر افسانہ نہیں مبنی بر حقیقت تھی۔

قدرت اللہ شہاب نے ۳۹-۱۹۳۸ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے (**ایم اے**) انگریزی کرنے کے بعد ۱۹۴۱ء میں **انڈین سول سروس** کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ سول سروس اکیڈمی دھرہ دون میں دورانِ تربیت ان کی خفیہ رپورٹ میں لکھا گیا تھا:

یہ شخص اس سروس کے لیے مکمل طور پر مِس فٹ ہے۔

(بہ حوالہ: انٹرویو: **قدرت اللہ شہاب**، مشمولہ: یہ صورت گر کچھ خوابوں کے / مرتبہ: **طاہر مسعود**)

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس خفیہ رپورٹ کا 'مِس فٹ آفیسر' آزادی سے قبل اڑیسہ، مغربی بنگال اور بہار کے مختلف اضلاع میں **ڈپٹی کمشنر** رہا۔ قیامِ پاکستان کے بعد **غلام محمد، میجر جنرل سکندر مرزا، جنرل ایوب خاں** اور **ذوالفقار علی بھٹو** کے عہد ہائے حکومت میں نہ صرف سیکرٹری، وفاقی سیکرٹری برائے اطلاعات، نشریات و تعلیم رہا۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ **قدرت اللہ شہاب** کے اس عروج کے معاون و مددگار، کون سے خفیہ ہاتھ تھے، ان پر تا حال پردہ پڑا ہے، لیکن کچھ فسوں پھونکنے والی زبانیں تھیں اور جادو بھری تحریریں۔

قدرت اللہ شہاب کی معاون و مددگار مشاورت کے چند نام تو 'شہاب نامہ' کا دیباچہ ہی فراہم کر دیتا ہے۔ دیباچے میں یہ اعتراف موجود ہے کہ 'شہاب نامہ' کے ادبی مشیران **ممتاز مفتی، بانو قدسیہ** اور **اشفاق احمد** تھے، جبکہ 'شہاب نامہ' رقم کرنے کی تحریک **ابنِ انشا** سے ملی۔ 'شہاب نامہ' کے متن سے دو نام اور مل جاتے ہیں، **جمیل الدین عالی** اور **شاہد احمد دہلوی**۔

ممتاز مفتی، بانو قدسیہ اور **اشفاق احمد** کو اطلاعات و نشریات کے شعبے میں **قدرت اللہ شہاب** کی آشیر باد حاصل رہی۔ **ممتاز مفتی** ۵۱-۱۹۵۰ء میں بطور اسٹاف آرٹسٹ/ اسکرپٹ رائٹر آزاد کشمیر ریڈیو، تراڑ کھل رہے۔ اس کے بعد ۱۹۵۱ تا ۱۹۵۷ء **اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر کشمیر پبلسٹی ڈائریکٹوریٹ** راول پنڈی، ۱۹۵۷ء ہی میں بطور فلم آفیسر **ڈی اے ایف پی** کراچی گئے۔ ۶۰-۱۹۵۸ء میں **ویج ایڈ ڈائریکٹوریٹ** کراچی میں رہے۔ ۱۹۶۰ء میں جب **قدرت اللہ شہاب وفاقی سیکرٹری برائے اطلاعات و نشریات** تھے تو **ممتاز مفتی** کو بطور **اسسٹنٹ ڈائرکٹر، وزارتِ اطلاعات**، راول پنڈی لایا گیا۔ خود **ممتاز**

مفتی نے ادبیات اسلام آباد کے لیے مجھے انٹرویو دیتے ہوئے تین باتیں تسلیم کیں:

۱۔ **ممتاز مفتی** نے **قدرت اللہ شہاب** کے اشارے پر **جنرل محمد ایوب خاں** کی خوشنودی کے لیے جماعتِ اسلامی کے خلاف اور **مولانا مودودی** کی کردار کشی کے حوالے سے ایک کتاب بہ زبانِ اردو، بہ عنوان: جماعتِ اسلامی **ممتاز حسین** عاصی کے فرضی نام سے لکھی، جسے مکتبہ جدید (لاہور) نے ۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔

۲۔ **ممتاز مفتی** نے جماعتِ اسلامی کے خلاف ایک کتاب بہ زبانِ انگریزی، بہ عنوان: *Delusion of Grandeur* بھی فرضی نام سے قلم بند کی۔ یہ کتاب بھی مکتبہ جدید (لاہور) نے ۱۹۶۵ء میں شائع کی۔

۳۔ ۱۹۶۰ء میں جب **قدرت اللہ شہاب**، **جنرل محمد ایوب خاں** کے سیکرٹری برائے اطلاعات تھے، تو **ممتاز مفتی** کو **آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی** کے طور پر ایوانِ صدر، راولپنڈی لایا گیا، جہاں وہ ۱۹۶۳ء تک کام کرتے رہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب قومی نوعیت کی بعض اہم دستاویزات ان الماریوں سے چوری ہوگئیں، جنھیں **ممتاز مفتی** کی تحویل میں رکھا گیا تھا۔ ان از حد اہم قومی دستاویزات کے چوری ہو جانے پر بھی Custodian بچ گیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے، کیسے؟ کیوں کر بچ گیا؟

سوائے اس کے کچھ نہ ہوا کہ تادیبی کارروائی کے طور پر **ممتاز مفتی** ۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۶ء **او ایس ڈی وزارتِ اطلاعات** رہے اور ۱۹۶۶ء میں ہی باعزت ریٹائر ہو گئے۔ یوں **مفتی جی** کی بزرگی بھی شک سے بالا ہے۔ جہاں تک **اشفاق احمد** کا معاملہ ہے تو نہ صرف ان کے ریڈیو پاکستان سے مستقل تعلق کے پیچھے **قدرت اللہ شہاب** کا خفیہ ہاتھ دکھائی دیتا ہے بلکہ **اشفاق احمد** (**ایم اے**) [**اردو**] سیکنڈ ڈویژن کے بطور لکچرر شعبہ اردو پرائیویٹ دیال سنگھ کالج (لاہور) کام کرتے کرتے یکلخت روم یونیورسٹی، اطالیہ پہنچ جانا اور وہاں سے براڈ کاسٹنگ ٹریننگ نیویارک یونیورسٹی (امریکہ) تا ہو آنا، لگ بھگ چالیس برس ریڈیو پروگرام 'تلقین شاہ' براڈ کاسٹ ہونا اور **اشفاق احمد** کا ۱۹۶۶ء تا ۱۹۹۲ء پورے چھبیس سال مرکزی اردو سائنس بورڈ (لاہور) کا ڈائرکٹر رہنا 'صوفی شہاب' ہی کے دستِ قدرت کے ادنیٰ

سے معجزہ جات ہیں۔ جبکہ **بانو قدسیہ** نے ریڈیو کے لیے ڈراما: 'عاصمہ'، 'اس دیوانگی میں'، 'اُڈاری'، 'کرم فرما'، 'دھواں'، 'اُچی ماڑی'، 'کچ دا بنگلہ' اور 'سایہ گل' کی صورت تواتر کے ساتھ لکھا اور نشر ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ریڈیو کے واحد طاقت ور میڈیا ہونے کے سبب اچھے اچھوں کے ریڈیائی ڈرامے رد کر دیے جاتے تھے۔ **اشفاق احمد** اور **بانو قدسیہ** کا یہی معاملہ پاکستان ٹیلی ویژن پر رہا۔ **اشفاق احمد** نے تو پاکستان ٹیلی ویژن لاہور سینٹر سے ایک اسٹوڈیو اپنے گھر 'داستان سرائے' ۱۳۱-سی، ماڈل ٹاؤن (لاہور) میں ہی بنوالیا، تاکہ ٹیلی ویژن سنٹر بھی نہ جانا پڑے۔ وہیں پر بیٹھے بیٹھے پروگرام کرتے تھے۔ اس ضمن میں **بانو** اور **اشفاق**، **قدرت اللہ شہاب** کے شکر گزار کیوں نہ ہوں۔ جب کہ **شاہد احمد دہلوی** کا شکر گزاری پر مبنی لجاجت آمیز مکتوب، بابت: ۲۷/اگست ۱۹۶۳ء 'شہاب نامہ' کا حصّہ ہے۔ جو خاصا شرمناک ہے۔ **قدرت اللہ شہاب** نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا ہے کہ 'ان کی منسٹری کے ایک معمولی اسسٹنٹ' (**جمیل الدین عالی**) نیشنل بینک آف پاکستان کے اعلیٰ ترین عہدے تک جا پہنچے۔ اسی طرح **ابنِ انشا** کے نیشنل بک کونسل آف پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل تک درجات کی بلندی میں **قدرت اللہ شہاب** کی بزرگی کو دخل رہا۔ یہ چند ایک ایسے کرشمے ہیں، جو **قدرت اللہ شہاب** کو **'ولی اللہ'** اور **'پہنچا ہوا بزرگ'** ثابت کرتے ہیں۔

قدرت اللہ شہاب نے 'شہاب نامہ' کے دیباچہ بہ عنوان 'اقبالِ جرم' میں خود تسلیم کیا کہ 'شہاب نامہ' کی بنیاد ۹/جون ۱۹۳۸ء کی ایک ذاتی ڈائری تھی، جسے دیکھ کر **ابنِ انشا** نے مشورہ دیا کہ 'شہاب نامہ' لکھیے، جس میں زندگی بھر کے مشاہدات و تجربات بھی سمٹ جائیں اور وہ 'گند' بھی صاف ہو جائے جو **قدرت اللہ شہاب** جیسی پاک باز شخصیت کو داغ دار کر رہی ہے۔ سو، **قدرت اللہ شہاب** نے 'شہاب نامہ' لکھا۔ لیکن آپ بے شک پورا 'شہاب نامہ' پڑھ لیجیے۔ آپ کے ذہن میں یہ سوال بار بار جنم لے گا کہ یہ کیسا اقبالِ جرم ہے، جس میں **قدرت اللہ شہاب** کی ذات اور کردار پر عائد کردہ الزامات کا تذکرہ تو موجود ہے لیکن (مجرم نہ سہی، ملزم ہی سہی) 'شہاب نامہ' سے **قدرت اللہ شہاب** کی بریت کا کوئی نکتہ برآمد نہیں ہوتا۔

ایک زمانہ تھا جب **حفیظ جالندھری**، **سید محمد جعفری** اور **حبیب جالب** نے جب بھی **جنرل محمد**

ایوب خاں کی پالیسیوں پر طنز کیا تو ایک آدھ چپت **قدرت اللہ شہاب** کو ضرور لگائی۔ لہٰذا شہاب نامہ ' تحریر کرنا **قدرت اللہ شہاب** کے لیے تو ضروری تھا ہی، **ابنِ انشا، ممتاز مفتی، اشفاق احمد، جمیل الدین عالی**، اور **بانو قدسیہ** کی بھی ایک اہم ضرورت تھی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ **قدرت اللہ شہاب** نے گندگی کو بھی صاف کرنا چاہا اور شہاب نامہ ' کی تکمیل کے بعد اسے تادمِ مرگ اشاعت کو بھی نہیں دیا۔ انھوں نے شہاب نامہ ' کا مسودہ اس وصیت کے ساتھ لاکر رکھوا دیا کہ یہ مواد ان کی وفات کے بعد شائع ہو۔ اور یہی ہوا۔ شہاب نامہ ' ان کی وفات ۲۴/ جولائی ۱۹۸۶ء کے بعد جولائی ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا، اور متعلقین نے خوب چاندی بنائی۔

شہاب نامہ ' کے **بابِ اوّل تا پنجم** کو دیکھیں تو **قدرت اللہ شہاب** کا انتہائی کم عمری میں حیدر آباد (دکن) کے وزیرِ اعظم سر **اکبر حیدری** کی جانب سے ملنے والی کتب کے بدلے ریاست سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ پیش کرنے سے انکار اور **مہاراجہ ہری سنگھ** (جموں و کشمیر) کی بے التفاتی دیکھ کر انگلستان میں فارسٹری کی تعلیم کا وظیفہ مسترد کر دینا، اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اوائل عمری میں از حد انا پیشہ اور غیرت مند انسان رہے۔ لیکن یہ وصف انھوں نے رفتہ رفتہ کھو دیا۔

غیرت مندی اور انا پیشگی کے احساس سے رفتہ رفتہ تہی دست ہوتے چلے جانے کا پہلا ثبوت شہاب نامہ ' کے **ساتویں باب** میں سامنے آتا ہے، جب **قدرت اللہ شہاب**، ڈاکٹر **رادھا کرشنن** پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> انٹرویو بورڈ کے تین ممبر تھے۔ سرگورڈن ایرے،
> سر عبدالرحمن اور ڈاکٹر سر رادھا کرشن،
> موخر الذکر وھی ذات شریف تھے، جنھوں نے بعد
> میں 'سر' کاٹ کر کانگریس کی بھینٹ چڑھا دیا۔

واضح رہے کہ ڈاکٹر **رادھا کرشنن** کا شمار برِّصغیر کے بڑے فلاسفروں میں ہوتا ہے۔ وہ ہندوستان کے صدر بھی رہے۔ **قدرت اللہ شہاب** کی نظروں میں ان کا قصور یہ ہے کہ قومی غیرت و حمیت کے تقاضے کے تحت انھوں نے سرکارِ انگلشیہ کی جانب سے عطا کردہ 'سر' کا خطاب واپس کر دیا۔

جب کہ ڈاکٹر **رادھا کرشنن** کا اتنے بڑے اعزاز کو ٹھکرا دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ **آغا خاں**، **شاہنواز بھٹو**، **عبدالقادر**، **محمد شفیع**، **محمد امین**، **ظفراللہ** حتیٰ کہ ڈاکٹر **محمد اقبال** بھی ایسا نہ کر سکے۔

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ حکومتِ برطانیہ کی جانب سے Knighthood کا یہ اعزاز **مہاتما گاندھی**، **موتی لال نہرو**، **جواہر لال نہرو**، مولانا **ابوالکلام آزاد**، ڈاکٹر **ذاکر حسین** اور **سردار پٹیل** کو کیوں نہ ملا؟ یہ الگ بات کہ اگر 'سر' کا خطاب کسی طور **قدرت اللہ شہاب** کو مل سکتا تو وہ اس کے حصول کے لیے سر کے بل جاتے۔

شہاب صاحب ایک جانب تو ڈاکٹر **رادھا کرشنن** پر طنز فرما رہے ہیں، اور دوسری جانب آئی سی ایس کر جانے والے **قدرت اللہ شہاب** اس بات پر فخر کر رہے ہیں کہ **آئی سی ایس** میں کامیابی پر ان کے گھر مبارک باد کی غرض سے آنے والوں میں **شیخ عبداللہ** بھی شامل تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ **قدرت اللہ شہاب**، 'شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ' کے سیاسی نظریات سے اتفاق کرتے تھے، یا اس **شیخ عبداللہ** کے سیاسی نظریات کے حامی تھے جس نے آخری زمانے میں جموں و کشمیر کی وزارتِ عظمیٰ سنبھالے رکھنے کے عوض پاکستان کی کھلم کھلا مخالفت شروع کر دی تھی؟ اس سوال کا جواب اس لیے بھی ضروری ہے کہ مختلف ادوار میں حکومتِ پاکستان اور ہمارے قومی اخبارات نے **شیخ عبداللہ** کو کبھی تو **'شیرِ کشمیر'** کہا اور کبھی 'گیدڑِ کشمیر'۔

'شہاب نامہ' کا ہر ایک قاری اس بات پر حیران ہے کہ پنج پیر کے مزار پر سے ایک آئی سی ایس آفیسر بطور نذرانہ، ڈالا ہوا سو روپیہ اٹھا کر اپنی جیب میں کیسے ڈال لیتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ **قدرت اللہ شہاب** کے اس عمل کو اخلاقی گراوٹ کے اس تسلسل میں دیکھا جائے، جس کی مثالیں آگے پیش کی جا رہی ہیں۔ فی الوقت **شہاب صاحب** آئی سی ایس کے اس اقدام کو بیورو کریسی کے جانب اٹھنے والے پہلے قدم کے طور پر لیجیے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ **قدرت اللہ شہاب** نے آٹھواں باب: 'صاحب، بنیا اور میں' تحریر کرتے ہوئے جہاں سرکارِ انگلشیہ کے افسران اور ہندوستان کے بنیے کا مضحکہ اڑایا اور طنز کے تیر برسائے، وہاں انھیں بطور بیوروکریٹ اپنا کردار بھول گئے۔ **لارڈ کلائیو** کو رشوت دینے والا بنگال کا **غدار میر جعفر**، بقول **قدرت اللہ شہاب**، بے شک 'بے غیرت' تھا لیکن، **ایوب خانی** دور میں، حق گو اور

آزاد منش ادبا و شعرا کو پاکستان رائٹرز گلڈ جیسے ادارے کی صورت نکیل ڈالنے کی پلاننگ کرنے والوں کو ہم کیا نام دیں؟

شہاب نامہ ' کا **نواں باب** ، بہ عنوان: 'بھاگلپور اور ہندو مسلم فسادات' قیامِ پاکستان کے قریب ہندو سیٹھوں اور انگریز سرکار کی ذہنیت کا اس لیے بھی کھرا عکاس ہے کہ اس وقت کی صورتِ حالات پر **قدرت اللہ شہاب** کا بس نہیں چلتا۔ اسی طرح شہاب نامہ ' کا **دسواں باب** بہ عنوان: 'ایس ڈی او' بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس باب میں **قدرت اللہ شہاب** نے صوبہ بہار کے ضلع گیا کی یادیں قلم بند کی ہیں۔ لیکن اس باب کا وہ حصّہ خاص طور پر قابلِ غور ہے، جس میں بہار کے باسی 'فرمائیے' کے بجائے 'بکیے' کہتے ہیں اور 'شام کی چائے' کو 'ناشتہ' کا نام دیتے ہیں تو **شہاب صاحب** کھلکھلا کر ہنستے ہیں۔ محاورے اور روزمرہ کا یہی فرق دلّی والوں اور بہار کے ادبا و شعرا کے بیچ تا حال وجہِ تنازعہ اور طرفین پر طنز و تشنیع کا باعث ہے۔

شہاب نامہ ' کے **گیارھویں باب** میں **نیتاجی سبھاش چندر بوس** کی عوام میں مقبولیت کا ذکر کیا گیا ہے، جس طرح جنگِ عظیم دوم کی نتیجہ خیزی سے قبل کے زمانے میں ہندوستان کے مقامی افراد اور انگریز سرکار کے نفسیاتی تجزیے کی ضرورت اب بھی محسوس کی جاتی ہے، وہیں اس شعلہ جوالہ یعنی **سبھاش چندر بوس** کی سیاسی حکمتِ عملی اور سرحد کے کسی نامعلوم مقام سے ایک چھوٹے ہوائی جہاز پر اڑان بھرنے اور جہاز کے پراسرار طور پر گر کر تباہ ہونے کے معاملات بھی تا حال پردۂ اخفا میں ہیں۔ **قدرت اللہ شہاب** نے تو اس حوالے سے کچھ نہیں لکھا، اے کاش! تاریخ کا کوئی طالبِ علم ان الجھاووں کو اپنا موضوع بنائے۔

شہاب نامہ ' کے **گیارھویں باب** میں سوائے اس واقعہ کے کہ **قدرت اللہ شہاب** نے ضلعی حاکم کے طور پر اپنے صوابدیدی کے اختیارات استعمال کرتے ہوئے گودام میں جمع شدہ غلہ بھوکے عوام میں تقسیم کر دیا اور تادیبی کارروائی کے طور پر ان کا تبادلہ بہار کے شہر سہسرام سے اڑیسہ کر دیا گیا، اس دور کی تاریخ پر کوئی قابلِ ذکر گواہی دکھائی نہیں دیتی۔

قدرت اللہ شہاب کے ضعیف العقیدہ ہونے کا ثبوت شہاب نامہ ' کا **بارھواں باب** بہ عنوان 'یملا کماری کی بے چین روح' ہے۔ **قدرت اللہ شہاب** کی اس کمزوری کو بھانپ کر **ممتاز**

مفتی جیسے دنیا دار اور **اشفاق احمد** جیسے جنتر منتر صوفی، ان کے لیے پیرِ تسمہ پا بن گئے۔ حال آنکہ یہ وہی **قدرت اللہ شہاب** ہیں جنھوں نے 'شہاب نامہ' کے پندرھویں باب: 'کراچی کی طوطا کہانی' میں یہ لکھا کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد نئی تعمیرات کے لیے سینیٹری کا سامان صرف مغربی پاکستان کے لیے منگوایا جانا ضروری خیال کیا گیا اور وزیرِ تعلیم مولوی **فضل الرحمٰن** کی اس تجویز کو ہنسی میں اڑا دیا گیا، جس میں انھوں نے کہا تھا کہ سینیٹری کا کچھ سامان ڈھاکہ کی نئی تعمیرات کے لیے منگوا لینا مناسب ہوگا۔ یہ سن کر ایک ممبر کمیٹی نے فرمایا کہ مشرقی پاکستان کے لوگ تو کیلے کے درخت کو آڑ بنا کر رفعِ حاجت کے عادی ہیں، ان کے لیے بیسن اور کموڈ منگوانے کی ضرورت نہیں۔

قدرت اللہ شہاب کو اس دور کی ایک معمول کی میٹنگ کا یہ واقعہ یاد رہ جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی سوچ مثبت تھی، جس کے رفتہ رفتہ زوال پذیر ہو جانے کے سبب دس سال پر محیط **ایوب خانی** آمریت کا جشن منانے کی پلاننگ خود **قدرت اللہ شہاب** نے کی اور ساری قوم کو ۱۹۷۱ء میں زوالِ ڈھاکہ کی صورت خجالت کا سامنا کرنا پڑا۔

یاد رہے کہ یہ وہی **قدرت اللہ شہاب** ہے، جس نے ۱۹۴۸ء میں نہ صرف قومی درد سے لبریز 'یا خدا' جیسا عمدہ ناولٹ تحریر کیا بلکہ بیوروکریسی کا ایک اہم پرزہ ہونے کے باوجود 'سرخ فیتہ' جیسے افسانے لکھے اور یہ سارا کچھ شائع کروانے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔

قدرت اللہ شہاب کی مثبت سوچ کی یہ لہر لازمہ تھا سنہ سینتالیس کے سانحہ فسادات کا، جس میں لاکھوں عصمتیں تار تار ہوئیں، ہزاروں مارے گئے اور کروڑوں بے گھر ہوئے۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ کاسہ لیس، مکار اور شاطر ادبا و شعرا کی ایک ٹولی نے عین اُنہی دنوں میں انھیں آ گھیرا۔ بقول **قدرت اللہ شہاب**، انھیں پہلے تو ملے **جمیل الدین عالی** اس کے بعد **شہاب صاحب** موم ہوتے چلے گئے اور **ابنِ انشا**، **ممتاز مفتی**، **اشفاق احمد** اور **بانو قدسیہ** وغیرہ کے لیے ان کے دل میں گنجایش پیدا ہوتی چلی گئی۔ **قدرت اللہ شہاب** کی یہ ایک طرح سے قلبِ ماہیت تھی۔

اس قلبِ ماہیت کے بعد ان کی زندگی اور زندگی کرنے کے رویے میں تبدیلیاں آئیں۔ اس ضمن میں **قدرت اللہ شہاب** کے درجِ ذیل بیانات ہی دیکھ لیجیے۔ ہندو پاک کی خفتہ سیاسی تاریخ پر ان کی گواہی اور تنازعہ کشمیر سے متعلق ان کی اپروچ ہی **گریگر سامسا** کے مکمل طور پر **کاکروچ** بن جانے کی

گواہی دیتی ہے:

قدرت اللہ شہاب، بیان نمبر:۱

۲۵/اگست ۱۹۴۷ء کو دھیر کوٹ (جموں و کشمیر) کے قریب نیلا بٹ نامی قصبے میں پاکستان کے ساتھ الحاق کے حق میں جلسہ عام پر ڈوگرہ پولیس اور بھارتی فوج کی بلا اشتعال فائرنگ ہوئی۔ جس کا جواب دو روز بعد **سردار اعبدالقیوم خاں** نے ڈوگرہ پولیس اور فوج کے ایک کیمپ کا صفایا کر کے دے دیا۔ (شہاب نامہ': **سولھواں باب** بہ عنوان: آزاد کشمیر)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس بیان میں **سردار عبدالقیوم خاں** کو ہیرو ثابت کیا جا رہا ہے۔ **قدرت اللہ شہاب** کا یوں بلا تحقیق **سردار عبدالقیوم خاں** کے من گھڑت بیانات پر اعتبار کرتے ہوئے، یا کسی خاص پالیسی کے تحت یہ لکھ دینا، کشمیر کی جدوجہدِ آزادی کی تاریخ مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ **سردار عبدالقیوم خاں** نے اپنے اسی نوع کے من گھڑت بیانات کے ذریعے خود کو کشمیر کی جنگِ آزادی (۱۹۴۷ء) کا مجاہدِ اوّل تسلیم کروایا اور اس کے بدلے متعدد بار صدر آزاد کشمیر اور وزیرِ اعظم رہ کر طویل مدت راج کیا۔

قدرت اللہ شہاب، بیان نمبر:۲

۲۷/اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کشمیری مجاہدین کے حملے کے نتیجے میں کشمیر کے **مہاراجہ ہری سنگھ** کی طرف سے ریاست کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کی درخواست ہندوستان نے فوراً قبول کر لی۔ (شہاب نامہ': **سولھواں باب** بہ عنوان: آزاد کشمیر)

قدرت اللہ شہاب کے اس بیان پر کیا تبصرہ کیا جائے۔ ہمارے ہاں ۱۹۴۷ء تا حال **قدرت اللہ شہاب** اور اُنہی کے بھائی بندوں کی طے کردہ پالیسی کے سبب اس حقیقت کو کبھی تسلیم نہیں کیا گیا کہ ہندوستان کی آزدی کے وقت برطانیہ نے ہندوستان کی ریاستوں کے والیان، راجاؤں اور مہاراجوں کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ **ہندوستان** یا پاکستان، جس کے ساتھ چاہیں الحاق کر لیں۔

قدرت اللہ شہاب: بیان نمبر:۳

مجاہدین کا لشکر، ۲۷/اکتوبر ۱۹۴۷ء کو سری نگر سے صرف ۳۵ میل کے فاصلے پر محض اس لیے رکا رہا کہ لشکر کے کمانڈر **میجر خورشید انور**، کشمیر کی آزادی سے قبل اپنے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کروا

لینا ضروری خیال کرتے تھے۔

قدرت اللہ شہاب، اپنے اس بیان کے ساتھ یہ گمان بھی کرتے ہیں کہ بہت ممکن ہے ہندوستان کے جاسوسوں کے ساتھ مل کر **شیخ عبداللہ** کی نیشنل پارٹی کے ایجنٹوں نے مجاہدین کی صفوں میں یہ افواہ پھیلا دی ہو کہ ہندوستانی فوج آئی کہ آئی؛ لہٰذا، واپس بھاگ جاؤ۔ (**شہاب** کے اس بیان کا یہی مطلب لیا جائے گا نا، کہ مجاہدین بھاگ گئے)

اس ضمن میں **شہاب صاحب** کا ایک بیان یہ بھی ہے کہ نیشنل کانفرنس جموں کشمیر کے راہنما **مقبول شیروانی** نے مجاہدین کے لشکر کو گمراہ کر کے سری نگر پر قبضے کا منصوبہ ناکام بنا دیا۔

مزید فرماتے ہیں:

''اس منصوبے کی ناکامی میں بھارتی ففتھ کالمسٹوں کے علاوہ قادیانیوں کا ہاتھ تھا۔ **غلام نبی گلکار** نامی ایک کشمیری قادیانی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس نے پونچھ میں جہاد کا رنگ دیکھتے ہوئے ۴/ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو راولپنڈی کے ایک ہوٹل **'ڈان'** میں بیٹھ کر **'آزاد جمہوریہ کشمیر'** کے قیام کا نہ صرف اعلان کیا بلکہ اپنی تیرہ رکنی کابینہ بھی منتخب کر لی، جس میں بیشتر افراد قادیانی تھے۔ اس کے بعد بقول: **شہاب**، **غلام نبی گلکار** ۶/ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو براستہ مظفر آباد، سری نگر پہنچا اور **شیخ عبداللہ** سے ملاقات کی۔ **قدرت اللہ شہاب** لکھتے ہیں کہ **غلام نبی گلکار** کا یہ منصوبہ یوں خاک میں مل گیا کہ مجاہدین، بارہ مولہ سے سری نگر کی جانب مسلسل پیش قدمی کرتے چلے جا رہے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ کشمیر بلا شرکت غیرے قادیانیوں کے ہاتھ نہیں آ سکتا، لہٰذا، انھوں نے ففتھ کالمسٹوں کا روپ دھار کا مجاہدین کو پلٹ آنے پر مجبور کر دیا۔

قدرت اللہ شہاب کے اس آخری بے ڈھبے قیاس پر تو سر پیٹ لینے کے ساتھ ہی داد دی جا سکتی ہے۔ اس لیے بھی کہ **شہاب صاحب** کے اس بیان میں **'ڈان ہوٹل'** راولپنڈی کے ساتھ غالباً لکھا گیا ہے۔ یعنی یہ بات بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہی گئی کہ **'ڈان ہوٹل'** میں یہ کارروائی ہوئی تھی یا نہیں۔ نیز سری نگر میں **غلام نبی گلکار** کی **شیخ عبداللہ** کے ساتھ ملاقات کی تفصیل بھی صیغہ راز میں رکھی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ **قدرت اللہ شہاب** کے پاس اس ضمن میں بھی کوئی ثبوت نہ تھا۔

قدرت اللہ شہاب، بیان نمبر:۴

۱۹۴۷ء جموں وکشمیر میں مجاہدین کی کارروائیوں کو دیکھتے ہوئے قائدِاعظم **محمد علی جناح** نے پاکستان کے انگریز آرمی چیف جنرل **ڈگلس گلیسی** کو کشمیر پر حملہ کرنے کو کہا لیکن اس نے حکم ماننے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ اپنے بھارتی ہم منصب فیلڈ مارشل **سر کلاڈ اوکنسلک** کو خبر بھی کر دی۔ جس کے نتیجے میں ہندوستانی فیلڈ مارشل نے اگلے روز پاکستان آ کر یہ دھمکی بھی دی کہ ہم برطانوی فوجی آفیسر واپس بلا لیں گے اور یوں سب کچھ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ (شہاب نامہ': **سولھواں باب**)

شہاب صاحب کے اس بیان سے ایک دلچسپ بات یہ معلوم ہوئی کہ اس زمانے میں پاکستان کے انگریزی آرمی چیف **جنرل ڈگلس گلیسی** کے A.D.C. مجاہدِ افغانستان، مردِ مومن، مردِ حق **جنرل محمد ضیاء الحق** تھے۔ اب کشمیر سے متعلق **قدرت اللہ شہاب** کے مختلف بیانات اور قیاسات سے پیدا ہونے والے قضیہ سے متعلق، نیز کشمیر کے مجاہدِ اوّل **سردار عبدالقیوم خاں** کے دعویٰ پر میجر (ریٹائرڈ) **محمود گیلانی** کا بیان ملاحظہ ہو: **محمود گیلانی** صاحب کا بیان ہے کہ ان کی ملاقات آزاد کشمیر میں سخی **دلاور سیاف** اور **کرنل محمود** نامی دو مجاہدین سے ہوئی۔ ان دونوں Proclaimed Self جرنیلوں کا دعویٰ ہے کہ ۲۷/اگست ۱۹۴۷ء کو کشمیر کی جنگِ آزادی سے متعلق اوّلین گولیاں اُنہی لوگوں نے کوٹلی سے چلائیں اور اکتوبر ۱۹۴۷ء کے اواخر تک وہ دھاوا بولتے ہوئے سری نگر **ایئرپورٹ** تک پہنچ گئے۔ اس وقت تک سری نگر **ایئرپورٹ** پر اس خدشے کے پیشِ نظر ڈرم رکھ دیے گئے تھے کہ کہیں **پاکستانی طیارے** لینڈ نہ کر جائیں۔

ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے سلسلے میں مجاہدین، حکومتِ پاکستان کی جانب دیکھ رہے تھے اور پاکستان کے وزیرِاعظم **لیاقت علی خاں** مجاہدین کی مدد کرنے میں ہچکچاہٹ اس لیے محسوس کر رہے تھے کہ کہیں ھندو پاک جنگ کا آغاز نہ ہو جائے۔ یوں اس محاذ پر مزید کامیابیوں کا حصول ناممکن ہو گیا۔ اس ضمن میں مزید تحقیق کے لیے میدان کھلا ہے۔ واضح رہے کہ اس باب میں جنرل **اکبر Conspiracy** نے بھی جنم لیا تھا، جس پر **قدرت اللہ شہاب** نے کوئی بات نہیں کی۔

شہاب نامہ' کے **سترھویں باب**: 'صلۂ شہید' میں **قدرت اللہ شہاب** فرماتے ہیں:

۱۶/اکتوبر ۱۹۵۱ء کی شام چار بج کر چھ منٹ پر راولپنڈی کے جلسہ عام میں گولی چلی۔

قائدِ ملت **لیاقت علی خاں** نے جامِ شہادت نوش کیا اور بطور قاتل **سید اکبر** کو گولی مار کر تحقیقات کا دروازہ بند کر دیا گیا (جبکہ **سید اکبر** اپنے بیٹے کے ساتھ جلسہ سننے آیا تھا۔ کوئی قاتل اپنے بیٹے کو ساتھ لیے نہیں آیا کرتا)۔

قدرت اللہ شہاب کا یہ بیان، اس دور کی بیوروکریسی کی جانب سے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ لیکن **شہاب صاحب** اکتوبر ۱۹۵۱ء میں نہ سہی، بعد میں تو یقیناً اس قابل رہے کہ اس محلاتی سازش کو بے نقاب کر سکتے تھے۔ پھر انھوں نے ایسا کیوں نہ کیا؟ کاش! **شہاب صاحب** یہی بتا دیتے کہ وہ 'بڑا' کون تھا جس کی ہدایت پر بقول **قدرت اللہ شہاب**، 'فرضی قاتل' (**سید اکبر**) کو جلسہ گاہ میں ہی گولی مار کر **لیاقت علی خاں** کے قتل کو اندھا قتل بنا دیا گیا۔ راولپنڈی کے **ایس پی نجف خاں** کا نام لے لینے اور یہ بتا دینے سے یہ سازش بے نقاب نہیں ہوتی کہ **سید اکبر** کو جلسہ گاہ میں گولی مروا نے والا **ایس پی نجف خاں** بہت جلد ڈی آئی جی بنا دیا گیا۔

ڈی آئی جی ہونا تو **ایس پی** سے اگلا قدم ہے اور **نجف خاں** کا ڈی آئی جی بن جانا کوئی انوکھی بات نہیں۔ کیا **نجف خاں** آؤٹ آف ٹرن ڈی آئی جی بنا دینا، اس قتل کا عوضانہ تھا تو یہ کیسی سازش تھی کہ **وزیرِ اعظم** کو گولی مار دینے کے فوراً بعد حق الخدمت بھی ادا کر دیا گیا۔ کیا اس عمل سے سازش کے بے نقاب ہو جانے کا خطرہ کسی 'بڑے' نے محسوس نہیں کیا؟

اسی طرح جب **شہاب صاحب** 'شہاب نامہ' کے **بائیسویں باب** میں بدنامِ زمانہ بینک کار **آغا حسن عابدی** کی تعریف کرتے ہیں تو لاحول پڑھنے کو جی کرتا ہے۔ اس لیے کہ جب **آغا حسن عابدی** کے قائم کردہ بینک BCCI (بینک آف کامرس اینڈ کریڈٹ انٹرنیشنل) کا 'مبنی بر فراڈ' کالے دھن کی منتقلی کا بینک کاری نظام ختم کیا گیا تو وہ آسمان سے زمین پر آ رہے، نہ صرف **آغا حسن عابدی**، بلکہ ان کے بہت سے چہیتے اور دل بند بھی، بطورِ خاص **افتخار عارف**۔ اردو مرکز، لندن بھی سمٹ گیا، جو پبلک ریلیشننگ کا اڈہ تھا۔ لیکن **شہاب صاحب** کے ممدوح **آغا حسن عابدی** اس درجہ کے استاد تھے کہ ان کے شاگردِ رشید **افتخار عارف** صرف ایک شعری مجموعے 'مہر دو نیم' (۱۹۸۴ء) پر حکومتِ پاکستان سے 'پرائڈ آف پرفارمنس' حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور بھلا ہو 'شریف برادران اور وزیرِ اعلیٰ سندھ **جام صادق** کا کہ **افتخار عارف** یہیں ٹک گئے

اور اکادمی ادبیات پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل (گریڈ-۲۰) مقرر ہوئے۔ کسی میٹرک پاس شخص کا براہ راست (گریڈ-۲۰) حاصل کرنا حیران کن واقعہ ہے۔ اس کے بعد **افتخار عارف** نے اپنی 'لیاقت' سے ڈاکٹر **جمیل جالبی** کے متبادل کے طور پر صدر نشین مقتدرہ قومی زبان (گریڈ-۲۱) کے علاوہ چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان کا چارج بھی سنبھالا (گریڈ-۲۲) لیا اور بطور چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان اپنے ہی زورِ بازو سے **'ستارۂ امتیاز'** اور **'ھلالِ امتیاز'** لے کر **'الطاف بھائی، الطاف بھائی'** کہتے ہوئے contract کئی بار renew کروایا۔ زبان و ادب میں ان کے کارہائے نمایاں کیا رہے اور تعلیمی لیاقت کتنی؟ اس طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔ یوں **قدرت اللہ شہاب** کے **ممدوح آغا حسن عابدی** کے **'پیرِ کامل'** ہونے میں بھی شک کی کیا گنجایش رہ گئی؟ یاد رہے کہ **شہاب صاحب** کے **ممدوح جنرل محمد ایوب خاں** کے نافذ کردہ مارشل لاء ۷/ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی ذلت سے لتھڑی ہوئی رات نے **اردو فکشن** کی سب سے اہم شخصیت ہم سے چھین لی۔ خود **قدرت اللہ شہاب** نے اقرار کیا ہے کہ **'قرۃ العین حیدر** کے تحت الشعور نے اس روز، اس لمحے پاکستان سے کوچ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔' **جنرل محمد ایوب خاں** کے مارشل لاء سے آزادیِ رائے کا گلا گھٹ گیا اور بقول **ن۔م۔راشد**: 'ملک میں آوازوں کا رزق بند ہو گیا۔' سنسر شپ کا آغاز ہوا، اور ۱۹۶۱ء میں **پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی نینس** جاری ہوا۔ اس نئے قانون کے تحت علاوہ عائد کردہ پابندیوں کے، حکومت نے یہ حق بھی حاصل کر لیا کہ وہ کسی بھی اشاعتی ادارے، جریدے اور چھاپہ خانے کو ضبط کر سکتی ہے۔ نامور صحافیوں، شعرا و ادبا کی بڑی تعداد نظر بند یا پابندِ سلاسل کر دی گئی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس ضمن میں **جنرل ایوب** کو **قدرت اللہ شہاب** کی مشاورت حاصل نہ ہو۔ اسی طرح **پاکستان رائٹرز گلڈ** کے قیام کو پاکستان کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو **جنرل صاحب** کی جھولی میں ڈالنے کی ایک طے شدہ سوچی سمجھی اسکیم قرار دیا گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ **پاکستان رائٹرز گلڈ** کے تجویز کنندگان (**جمیل الدین عالی** اور **شاہد احمد دہلوی**) کس کے تیار کردہ ایجنڈے پر عمل پیرا تھے؟

قدرت اللہ شہاب کے ۱۹۶۳ء میں ھالینڈ میں سفیر کے طور پر تقرر کے موقع پر **شاہد احمد دہلوی** کا مکتوب بنام **قدرت اللہ شہاب**، کس قدر شرمناک ہے۔ ملاحظہ ہو:

کل کے اخبار میں آپ کے ہالینڈ جانے کی خبر پڑھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مزید ترقیوں سے نوازا ہے۔ مگرہمیں تو ایسامعلوم ہو رہا ہے کہ ہم یتیم ہو گئے ہیں۔(اگرچہ یہ بڑی خود غرضی کی بات ہے) مستقبل ایک دم تاریک ہو گیا ہے۔

(مکتوب محررہ: ۲۷/اگست ۱۹۶۳ء، مشمولہ: شہاب نامہ، ص: ۷۹۷)

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو --مشہور زمانہ ادبی مجلّہ ساقی، کا مدیر کس درجہ لجاجت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

ایوب خانی دور میں ہی چند سازشی عناصر (جن میں **مشفق خواجہ** کا نام بھی لیا جاتا ہے) نے **شہاب صاحب** کی معاونت سے **بابائے اردو مولوی عبدالحق** کے خلاف ایک خفیہ مہم اس لیے چلائی کہ وہ **جنرل محمد ایوب خاں** کے خلاف بولتے تھے۔ یوں ان لوگوں نے **مولوی عبدالحق** کو ایک عضوِ معطل قرار دے کر انجمن ترقی اردو، کراچی (پاکستان) کا زمامِ اقتدار سنبھالا۔ اس سازش سے **مولوی عبدالحق** پوری طرح آگاہ تھے اور از حد رنجیدہ خاطر، لہٰذا، جب ان کی وفات سے چند روز قبل **قدرت اللہ شہاب** کے مشورے پر **جنرل محمد ایوب خاں** بیمار پُرسی کرنے ہسپتال پہنچے تو **بابائے اُردو** نے اپنا چہرہ دوسری جانب موڑ لیا۔(شہاب نامہ)

قدرت اللہ شہاب نے 'شہاب نامہ' میں یوں تو بہت سے عنوانات قائم کر کے لکھا، لیکن ایک عنوان ایسا ہے، جس سے وہ بچ کر چلے، یعنی: **ایوب خان** کی حسن پرستی۔ **بیگم ناہید سکندر مرزا** اور **جنرل محمد ایوب خاں** کے خوش گوار تعلقات کے بارے میں 'شہاب نامہ' خاموش ہے۔ اسی طرح برطانوی وزیر جنگ **جان پروفیمو** کو معزول کروانے والی مشہور کال گرل: **کرسٹائن کیلر** کے ساتھ جنرل صاحب کا ایک ہی سوئمنگ پول میں غسل فرمانے کا ذکر **شہاب صاحب** نے نہیں کیا۔ جبکہ یہ واقعہ برطانیہ کے وزیر جنگ **جان پروفیمو**، **مینڈی رائس ڈیوس** اور **کرسٹائن کیلر** کے جنسی اسکینڈل کے

ساتھ ایک مدت تک عالمی اخبارات کا موضوع رہا۔ اس دوران، پاکستان کا ہر اخبار **کرسٹائن کیلر** اور **مینڈی رائس ڈیوس** کے بیانات اور تصاویر شائع کر رہا تھا کہ یکا یک **کرسٹائن کیلر** اور **شہاب صاحب** کے ممدوح، **جنرل ایوب** کے ایک ہی سوئمنگ پول میں اکٹھے نہانے کا معاملہ زیر بحث آ گیا۔ **کرسٹائن کیلر** کا ایک بیان تو پاکستانی عوام کے لیے بم بلاسٹ ثابت ہوا، جس میں کہا گیا تھا کہ **ایوب خاں** نے **لارڈ آسٹر** کے سوئمنگ پول میں اسے (**کرسٹائن کیلر** کو) ٹانگ سے پکڑ کر اپنے جانب کھینچنے کی کوشش کی۔ جگ ہنسائی سے بچنے کے لیے، اس موقع پر **ذوالفقار علی بھٹو** (وزیر خارجہ) کو یہ بیان دینا پڑا کہ اس موقع پر میں خود وہاں موجود تھا اور **ایوب خاں صاحب** نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ بہرطور، خوب بھداڑی۔ **شہاب صاحب** تو اس واقعہ کے عینی شاہد تھے۔ اب اس باب میں ان کی خاموشی کو کیا نام دیا جائے؟

شہاب صاحب کی بے شک **جنرل محمد یحییٰ خاں** کے ساتھ نہیں بنی، لیکن انھوں نے وہ دور تو دیکھا اور اس پر بات بھی کی۔ پھر جانے کیوں، مصلحتاً اقلیم اختر عرف **جنرل رانی** اور فلمی اداکارہ **ترانہ** (جسے اس دور میں 'قومی ترانہ' کہا جاتا تھا) کا ذکر نہیں کیا۔ ان دنوں **اقلیم اختر** (**جنرل رانی**) اداکارہ **ترانہ** اور **پی آئی اے** کی ائر ہوسٹسوں کی پریزیڈنٹ ہاؤس، صدر کراچی اور راولپنڈی پریزیڈنسی میں ناوقت آمد سے خوب چہل پہل رہی۔ **شہاب صاحب** کو یاد ہی نہیں رہا کہ اس زمانے میں **ایس یو درانی** (**تہمینہ کھر** کے والد) **پی آئی اے** کے جنرل مینیجر تھے، جو نت نئی ائر ہوسٹسوں کی کھیپ کے ہمراہ، کشاں کشاں پریزیڈنسی، صدر کراچی تشریف لاتے تھے۔ اس دوران، ڈیوٹی پر موجود کراچی پولیس کا عملہ عجب مشکل میں رہا۔ میرے ایک قریبی رشتہ دار، **مرزا صفدر بیگ** ریٹائرڈ **ڈی ایس پی**، پریزیڈنسی صدر (کراچی) میں کھیلے جانے والے اس معمول کے کھیل کے عینی شاہد تھے۔ ان دنوں ہماری رہائش **آرٹلری میدان پولیس لائن** (کراچی) میں تھی اور میں ایس ایم (آرٹس) کالج (کراچی) کا طالب علم تھا۔

'شہاب نامہ' کا **آخری باب** 'چھوٹا منہ، بڑی بات' ہے، جس میں **قدرت اللہ شہاب** سخت مشکل میں دکھائی دیتے ہیں۔ **ممتاز مفتی**، **بانو قدسیہ** اور **اشفاق احمد** جیسے چاپلوس ممدوحین کی جانب سے عطا کردہ **'صوفی صافی ہونے کا خطاب'** نہ ان سے نگلا جاتا ہے، نہ اُگلا جاتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب میری موجودگی میں **ممتاز مفتی** نے **قدرت اللہ شہاب** کا مشہورِ زمانہ خاکہ **حلقۂ**

ارباب ذوق ،اسلام آباد میں پڑھا تھا اور خبر بنوانے کی کوشش میں کامیاب رہے تھے۔اس خاکے میں **ممتاز مفتی** نے **قدرت اللہ شہاب** کو **ولی اللہ** کے درجے پر فائز کرنے کی کوشش کی تھی۔

چند روز بعد **ممتاز مفتی** کے ہاں افسانہ نگار **رام لعل** کی بھارت سے آمد کے موقع پر **رشید امجد**، **احمد داؤد** اور میں نے ڈرائنگ روم کے کونے میں سمٹ سکڑ کر بیٹھے ہوئے **قدرت اللہ شہاب** کو جب صوفیانہ تجربات بیان کرنے کو کہا تو موصوف مونہہ ہی مونہہ میں کچھ منمنائے اور ہماری جانب بٹر بٹر تکتے رہے۔میں پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ از حد غیر متاثر کن شخصیت کے حامل انسان تھے۔افسوس کہ اگر اس روز بطور میزبان **ممتاز مفتی**، ہمیں جھاڑ پلاتے ہوئے انھیں صاف بچا نہ لے جاتے تو بہت ممکن ہے ہمیں **شہابی تصوف** کی حقیقت معلوم ہو جاتی۔

تحریکِ نسواں اور اردو ادب

علی احمد فاطمی

زمانۂ قدیم سے ہی عورت انسانی سماج کے لیے ایک پرکشش، متنازعہ اور مسائل سے پُر شخصیت رہی ہے۔ ہر دھرم اور مذہب میں خواتین کی تہذیب، تحریم، آزادی اور حد بندی کے بارے میں خوب خوب لکھا گیا ہے۔ رگ وید ، میں عورت کی افضلیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ بعض عورتیں بعض مردوں کے مقابلے بدرجہا بہتر اور مستقل مزاج ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے وید، میں عورتوں کی تعلیم کی باقاعدہ اجازت دی گئی ہے۔ مہابھارت، میں ایک جگہ یہ کہا گیا ہے کہ عورتیں نہ صرف یہ کہ خانگی زندگی کا مرکز ہیں بلکہ پوری سماجی تہذیب کی بنیاد ہیں تو اسی مہابھارت ، میں دوسری جگہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دنیا میں عورت سے زیادہ گنہگار کوئی چیز نہیں ہے۔ عورت تمام خرابیوں اور برائیوں کی جڑ ہے۔ اسلام میں اگر ایک طرف لڑکیوں کے دفن کرنے کے خلاف باقاعدہ سورہ نازل ہوئی تو دوسری طرف پردہ کرنے کا حکم دیا گیا حالانکہ یہ وہ پردہ نہیں ہے جو مدتوں سے ہندوستانی مسلم خواتین میں

رائج ہے۔ اسلام میں خواتین کو شوہر کے انتخاب سے لے کر اولاد کی تربیت تک خاصی آزادی دی گئی ہے۔ اسلام میں بھی زمانۂ قدیم سے عورتوں نے اس آزادی اور حق کا جائز استعمال کر کے اپنی صلاحیتوں کا اظہار بھی کیا ہے۔ ہر دور کے سماج نے اپنے اپنے مزاج اور رواج کے اعتبار سے عورت کو قبول بھی کیا ہے اور ردّ بھی کیا ہے۔ ہر دور کے دانش وروں اور فلسفیوں نے اپنے اپنے علم و تجربات کی روشنی میں عورت کے بارے میں اپنی اپنی آراء پیش کی ہیں اور بعض نے تو جد و جہد کی ہے اور بعض نے مخالفت بھی کی ہے۔ غرضکہ ہر دور میں عورتوں کی حمایت اور مخالفت دونوں طرح کی لہریں کام کرتی ہیں اور عورت اشتراک و اختلاف کے درمیان پستی، بکھرتی، سنورتی کبھی اپنے وجود پر نازاں رہتی تو کبھی آنسو بہاتی رہتی۔ قدرت کا یہ حسین تحفہ ہر دور میں کبھی آنکھوں سے لگایا گیا، کبھی مردوں کے اعتاب کا شکار رہا۔ کبھی عیش و تفریح کا سامان بنا، کبھی دیوی کا درجہ ملا، کبھی طوائف کا، کبھی اس کے لیے ملک بسائے گئے، کبھی ڈھائے گئے، کبھی جنت بسائی گئی اور کبھی جنت سے نکالی بھی گئی۔

تہذیب و تمدن اور ترقی و تبدیلی کے اعتبار سے ہر صدی کی اپنی الگ الگ تاریخ ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ھندوستان میں عورتوں کی ترقی کی نہ کوئی صدی ہے اور نہ کوئی باضابطہ تاریخ۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ ہندوستان کی ترقی میں عورت کا رول برائے نام ہے۔ ڈاکٹر **شمیم نکہت** لکھتی ہیں:

> یہ کہا جاتا ھے کہ عورتوں کا حصہ ھندوستان کی ترقی میں بھت کم ھے۔ یہ الزام صحیح ضرور ھے لیکن اس کی ذمہ داری عورتوں پر عائد نھیں ھوتی۔ عورتوں سے زیادہ ھندوستانی سماج اس کا ذمہ دار ھے... بچپن کی شادی تعلیم کا مسئلہ سیاسی حقوق سے محرومی، معاشی حیثیت سے عورتوں کا مردوں پر انحصار وغیرہ ایسی چیزیں تھیں جنھوں نے عورتوں کو ایسی سخت بندش میں گرفتار کردیا تھا جس کا ٹوٹنا آسان نھیں۔ سیکڑوں سال کی جمی ھوئی گرد کو

> پھونک کر نہیں صاف کیا جاسکتا۔(پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار ، ص:۵۸)

اورتحریکوں کے اعتبار سے انیسویں صدی غالباً آس پاس کی صدیوں کے مقابلے میں زیادہ اہم اور تاریخی ثابت ہوئی حالانکہ انیسویں صدی کے اس انتشار میں گزشتہ صدیوں کا خمار بولتا نظر آتا ہے۔ مغلیہ حکومت کے زوال اور بیرونی حملے حکومت کی کمزوری کا اشارہ تو کرتے ہی ہیں ساتھ ہی ان طاقتوں کو بھی ابھارتے ہیں جو کبھی پہلے دبے ہوئے تھے یا موقعے کی تلاش میں تھے۔ اس سلسلے میں ہندوستان میں جو طاقت سب سے زیادہ واضح طور پر سامنے آئی وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں انگریزوں کی طاقت تھی جو دھیرے دھیرے پورے ہندوستان پر چھا گئی۔ انگریز اپنی زبان وتہذیب کی تبلیغ وتشہیر چاہتے تھے لیکن یہ خوف بھی تھا کہ اگر سب کے سب انگریزی پڑھ گئے تو ہندوستان امریکہ نہ بن جائے اور ان کے قبضۂ قدرت سے نہ نکل جائے۔ ایسی صورت میں انھوں نے اپنی تہذیب کا خام مواد ہی پیش کرنا مناسب سمجھا اور پورے ہندوستان کو 'ھاچ پاچ' بنائے رکھنا چاہا لیکن بجلی، ریل، ٹیلی گراف اور دیگر سائنسی ترقیوں نے ہندوستان کی آنکھیں کھول دی تھیں اور سب سے زیادہ جس چیز نے اثر ڈالا وہ تھا پریس بقول **احتشام حسین**:

> جس چیز نے فوری طور پر شعور بننے میں مدد دی وہ پریس تھا۔ کیوں کہ انقلاب ۱۸۵۷ء تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اخبارات کافی تعداد میں نکلنے لگے تھے اور سیاسی بیداری میں مدد کررہے تھے۔(علی گڑھ تحریک کے اساسی پہلو)

مذہبی نقطۂ نظر سے **دورِ مغلیہ** ہندو مسلم یک جہتی کے اعتبار سے عہدِ زریں کہا جاسکتا ہے لیکن انگریزوں کی آمد اور مسیحی تصورات کی تبلیغ اور انگریزوں کے بعض دوسرے سیاسی ہتھکنڈوں نے ہندو اور مسلمان دونوں کو منفی اور مثبت اعتبار سے سوچنے پر مجبور کیا۔ قدیم وجدید کے تصادم اور روایت

وجدیدیت کے ٹکراؤ نے ایک تذبذب اور کشمکش کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ انگریزوں کی آمد نے نئے علوم زبان وتہذیب، سماج اور سیاست کا یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا جب تک ۱۸۵۷ء کا غدر نہیں ہو گیا۔ غدر کا ہنگامہ صرف ہندو مسلمان ہی نہیں بلکہ پورے ھندوستان کی تاریخی وتہذیبی زندگی میں سنگِ میل ثابت ہوا۔ تذبذب کی کیفیت قدرے رخصت ہوئی اور دو چیزیں واضح طور پر سامنے آ گئیں۔ پہلی یہ کہ ہندوستانیوں کی شکست نے کئی اعتبار سے مغرب کی برتری کا فیصلہ کر دیا۔ دوسرے یہ کہ اس نازک موڑ پر ہندو اور مسلمان دونوں کو کچھ اہم فیصلے کرنے پڑے۔ کہیں سمجھوتہ کرنا پڑا۔ کہیں شکست تسلیم کرنی پڑی اور کہیں عزم واستقلال کے ساتھ مستقبل کی فکر کی جانے لگی۔ کشمکش اور تذبذب کی کیفیت میں جب بھی کاری ضرب لگتی ہے تو یا تو قومیں ختم ہو جاتی ہیں یا پھر جاگ پڑتی ہیں اور کبھی کبھی اس حد تک کہ ان کی بیداری تحریک کا روپ لے لیتی ہے۔ غدر کے حادثے نے ھندوستان کے تمام شعبہ جات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ تبدیلی اور بیداری ان کی سرشت میں حلول کرنے لگی۔ ڈاکٹر **خلیق احمد نظامی** ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ۱۸۵۷ء ھندوستان کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ھے۔ قدیم اور جدید کے درمیان یھی وہ منزل ھے جھاں سے ماضی کے نقوش پڑھے جاسکتے ھیں اور مستقبل کے امکانات کا بھی جائزہ لیا جاسکتا ھے۔

یہی وہ اہم موڑ ہے جہاں سے گزر کر ہندوستانی عوام نئے خیالات کے ساتھ نئی بنیادوں پر جدید ہندوستانی قومی تحریک تعمیر کرنے کے قابل ہو گئے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ترقی اور تبدیلی کے بادل منڈلانے لگے۔ ایسی صورت میں ممکن ہی نہ تھا کہ عورتوں کی دنیا میں بھی تبدیلی نہ آئے۔ تبدیلیاں آئیں اور خوب آئیں اور اس حد تک کہ رفتہ رفتہ تحریک کی شکل اختیار کر گئیں۔

عورتوں کی بیداری کو بھی حرکت اور تقویت انگریزوں کی آمد سے ملی۔ جب انگریز عورتیں ہندوستانی عورتوں کے درمیان جا کر تبلیغ کرنے لگیں تو انھیں ہندوستانی عورتوں کے زبردست پچھڑے پن کا احساس ہوا چنانچہ اس احساس اور سفارش پر پہلی بار ۱۸۵۴ء میں انگریزوں کی طرف سے ایک

سرکاری اعلان ہوا۔ڈاکٹر **رفیعہ سلطانہ** لکھتی ہیں:

۱۸۵۴ء میں سر چارلس لاڈس نے ایک مراسلے
میں حکومت کے ذریعہ اعلان کیا کہ ابتدائی
تعلیم لڑکیاں اسکولوں سے حاصل کرسکتی ہیں
(اردو ادب میں خواتین کا حصہ)

سرکاری اعلان سے قوم قدرے حرکت میں آئی۔دوراندیشی اور وقت کی ضرورت نے اس کی ابتدا کردی کہ لوگ اپنی لڑکیوں کو اسکولوں میں داخل کرانے لگے۔اس کے ساتھ ساتھ عیسائی مشنریوں نے بھی عورتوں کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ دی۔ایک خیال یہ بھی تھا کہ اس اعلان کا مقصد انگریزی اور عیسائی تہذیب کی تبلیغ کا غلبہ تھا لیکن اس سے بہرحال فائدہ پہنچا۔**ہندو سماج** بیدار ہوا۔ **آریہ سماج** اور **برھمو سماج** نے باقاعدہ عورتوں کی تعلیم کا مشن چلایا اور **ہندو سماج** کو بعض بندشوں سے آزاد کرانے کی قابلِ قدر کوششیں کیں جس سے عورتوں کو سماجی اور مذہبی کاموں میں حصہ ملنے لگا۔ ان کوششوں سے ابتدائی ماحول تیار ہوا۔

عورتوں کی تعلیم عام کرنے میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی میدان میں نکل پڑیں۔ اس سلسلے میں جن چند خواتین کے نام لیے جاسکتے ہیں ان میں **مسز بی کے گوکھلے** (بنگال) مسٹر .....(مہاراشٹر) **مسز پاروتی چند شیکھر** (میسور) بہت اہم ہیں۔یہ خواتین ہندوستان کے مختلف صوبوں سے تعلق رکھتی ہیں ان کی کوششوں سے ہندوستان کے تقریباً تمام صوبوں میں تعلیمِ نسواں کا شوق بڑھنے لگا۔چونکہ ان خواتین میں بیشتر متمول گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اس لیے باقاعدہ ایک ادارہ قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔اس سلسلے میں پہلا اہم ادارہ *Widow House* قائم کیا گیا جس کا مقصد عورتوں کی تعلیم وتربیت پر توجہ دینا تھا۔ان کوششوں کو دیکھ کر بڑی تعداد میں عورتیں گھروں سے نکل آئیں اور اس مشن میں شامل ہوگئیں۔**مہارانی میسور، مہارانی بڑودہ** اور **بیگم بھوپال** نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ان تمام کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ عورتیں، تعلیم خصوصاً انگریزی تعلیم کی طرف بڑھنے لگیں اور علم وہنر کے راستے ان کے لیے کھلنے لگے۔۱۸۸۳ء میں پہلی بار ایک ہندوستانی خاتون گریجویٹ ہوئی۔۱۸۹۲ء میں پہلی بار ہندوستانی عورت ڈاکٹری پڑھنے کی غرض سے آکسفرڈ گئی۔

۱۸۸۵ء میں کانگریس کا قیام عمل میں آیا اور تمام بیداریوں کے ساتھ ساتھ آزادی کا احساس وادراک تیز ہوتا چلا گیا۔ آزادی کی اس منظّم کوشش اور اسپرٹ نے جہاں ایک طرف عورتوں کو جدوجہد اور مشن کو طاقت پہنچائی تو دوسری طرف خواتین نے بھی آزادی کی لہر تیز کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ جس کا اعتراف **مہاتما گاندھی** نے ان جملوں میں کیا:

> جنگِ آزادی میں ہندوستانی عورتوں نے جو
> کام کیا ہے وہ سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔

۱۹۱۴ء میں **تحریکِ آزادی** اور **تحریکِ نسواں** دونوں کی ملی جلی سرگرمیوں کے درمیان ایک گراں قدر خاتون **مسز اینی بیسنٹ** کا نام تیزی سے اُبھر کر آیا۔ **مسز اینی بیسنٹ** غالبًا پہلی خاتون ہیں جو دونوں سطح پر سرگرم رہیں۔ **مسز بیسنٹ** نے ۱۹۱۷ء میں آل انڈیا ویمنس کانفرنس منعقد کی جس کی وہ صدر منتخب ہوئیں۔ بحیثیت صدر انھوں نے اعلان کیا:

> اگر ہندوستانی اپنی اور اپنے ملک کی نجات اور
> بھبودی چاھتے ھیں تو انھیں عورتوں کی اصلاح
> کرنی چاھیے۔

ان کی یہ اپیل سارے ملک میں گونج گئی اور آزادی و بیداری کی ایک نئی لہر پیدا کر گئی۔ **مسز بیسنٹ** کی ان کوششوں سے ۱۹۱۷ء میں ہی عورتوں کی ایک تنظیم مدراس میں قائم ہوئی۔ اس کا اثر یہ پڑا کہ عورتوں کی آزادی کی تحریک دن بدن تیز ہوتی گئی اور دیکھتے دیکھتے ملکی سطح پر دو چار پڑھی لکھی خواتین اُبھر کر سامنے آئیں جن میں **سروجنی نائیڈو**، **کستور با گاندھی**، **بی اماں** اور **وجے لکشمی پنڈت** وغیرہ خاص ہیں۔ یہ خواتین ایک طرف سیاسی تحریک میں شامل تھیں تو دوسری طرف عورتوں کی سماجی بہبودی میں تاریخی رول ادا کر رہی تھیں۔ عین اسی زمانے میں دنیا کی تمام خواتین اپنے ووٹ کے حق کی لڑائی لڑ رہی تھیں اور جس میں انھیں کامیابی بھی مل رہی تھی۔ **ڈاکٹر شمیم نکہت** نے اس کا بیورا، اس طرح پیش کیا ہے:

> دنیا میں عورتوں کو ووٹ دینے کا سب سے پھلا
> حق نیوزی لینڈ میں ۱۸۹۴ء میں دیا گیا۔ اس کے
> ۱۹۰۲ء میں آسٹریلیا، ۱۹۱۷ء میں انگلینڈ، ۱۹۱۸ء

میں کنیڈا، ۱۹۲۴ء میں منگولیا کی عورتوں کو
حق رائے دھندگی ملا۔

ہندوستان میں اس سلسلے میں آل انڈیا ویمنس کانفرنس نے تحریک چلائی۔ انگریزی حکومت انکار کرتی رہی آخر کار ۱۹۲۶ء میں پہلی بار خواتین کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوا۔ اسی سال پہلی بار خواتین نے الیکشن میں بھی حصہ لیا۔

۱۹۳۲ء میں ایک ادارہ *Lady India Home Science Conference* کے نام سے قائم ہوا۔ اس ادارے کا مقصد عورتوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی سے دلچسپی پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ عورت گھروں سے نکل کر میدانوں، کھلیانوں اور کارخانوں میں آ گئی اور مردوں کے ساتھ ساتھ ایک نئے نظام کا خواب دیکھنے لگی۔ زندگی کے دوسرے شعبوں اور بالخصوص جنگِ آزادی کی سرگرمیوں کو دیکھ کر ہی ۱۹۳۱ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس کراچی میں ہوا تو اس میں عورتوں کو بہت سارے دستوری حقوق دیے جانے کا اعلان ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس اعلان سے عورتوں کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے اور پھر عورتیں رفتہ رفتہ زندگی کے تمام شعبوں میں دکھائی دینے لگیں۔ آزادی کی اس جنگ میں عین اسی دور میں عورتوں کے مساوی حقوق دینے اور جدوجہد آزادی میں برابر سے شریک رہنے کا سہرا **مہاتما گاندھی** کے سر جاتا ہے جو عورتوں کی عزت کرتے تھے اور دوسروں سے عزت کی تلقین کرتے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں پریس کی ایک کانفرنس میں انھوں نے بڑے فخر سے یہ بات کہی:

میں یورپ کی عورتوں کو یہ پیغام دے رہا ہوں
کہ انہیں ہندوستانی عورتوں کی پیروی کرنی
چاہیے جو پچھلے سال ایک دم عوامی تحریک کے
لیے اٹھ کھڑی ہوئیں اور مجھے یقینِ کامل ہے کہ
اگر یورپ میں عورتیں عدم تشدد سے سبق لیں
تو انہیں سکون اور اطمینان حاصل ہوسکتا ہے۔

ایک دوسری جگہ انھوں نے کہا:

جنگِ آزادی میں ہندوستانی عورتوں نے جو

کام کیا ھے وہ سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔

غدر کا یہ حادثہ مسلمانوں کے عروج وزوال کی عجیب وغریب کہانی پیش کر گیا۔ انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت حاصل کی تھی۔ غدر کے حادثے میں مسلمان آگے آگے تھے اس لیے غدر کے بعد ہر اعتبار سے متاثر ہونے والی قوم مسلمان تھی۔ ہر سطح پر یہ قوم شکست وریخت کا شکار تھی۔

مذہب کی دنیا میں **ولی اللٰہی تحریك** نے اجتہاد پر زور دے رکھا تھا۔ یہ اجتہاد وتقلید کے خلاف تھا۔ **وھابی تحریك** نے جارحانہ رُخ اختیار کر رکھا تھا۔ **سید احمد شہید** اور **اسماعیل شہید** کی کوششوں نے شدت اختیار کر لی تھی۔ مسلمانوں میں عام بے چینی پھیل رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے نتائج سامنے آچکے تھے۔ صورتِ حال بدل چکی تھی اور مسلم سماج کئی طرح سے فیصلہ کن موڑ پر آ گیا تھا۔ پورے ملک کا ڈھانچہ بدل رہا تھا، سماجی باگ ڈور جاگیردارانہ نظام کے ہاتھوں سے نکل کر نئے طبقات میں پہنچ کر نئی شکل اختیار کر رہی تھی۔ ایسی متذبذب اور متبدل صورتوں میں حال کو سمجھنا اور مستقبل پر کڑی نگاہ رکھنا ہر ایک کے بس کا کام نہ تھا۔ اس لیے جن لوگوں نے ایسی تبدیلیوں سے آنکھیں چار کیں اور قوموں کی رہنمائی کی خود ان کی زندگی میں نشیب وفراز آئے۔ **سرسید** اس کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ **سرسید** واحد شخص یا رہنما تھے جنھوں نے پہلے ملکی اور بعد میں مسلمانوں کی صورتِ حال، عروج وزوال پر نگاہیں جمائیں اور ان کی زوال پذیر صورتوں کو دیکھ کر ان کی اصلاح کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ علی گڑھ مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ تہذیب الاخلاق نکالا اور اپنے ساتھ پورا، ایک قافلہ تیار کیا بقول **احتشام حسین**:

> سرسید کے ساتھ بہت سے مخلص علم پرور اور انتھك اور پرجوش کام کرنے والے تھے جو ھواؤں کا رُخ پھچانتے تھے اور وقت کے تقاضوں کا احساس رکھتے تھے اور علی گڑھ کالج محض ایك علامت تھا اس نئی زندگی میں داخل ھونے کی جو اپنا در کھولے ھوئے اندر آنے کی دعوت دے رھی تھی۔ اس دروازے کے اندر مختلف قسم کے

کارواں داخل ہورھے تھے۔

یہاں **سرسید** یا علی گڑھ تحریک کا جائزہ لینا مقصد نہیں لیکن عورتوں کی بیداری، تعلیم و تربیت کے سلسلے میں **سرسید** اور ان کے رفقا کس قسم کا جذبہ و نظریہ رکھتے تھے یہ تحقیق طلب ہے اور بحث طلب بھی۔ اس لیے جن لوگوں نے آگے چل کر اسی علی گڑھ میں مسلم عورتوں کی تعلیم کو ایک تحریک کی شکل میں پیش کیا وہ **سرسید** کے محتاط رویے سے متعلق ان کی زندگی میں خاموش اور ان کی موت کے بعد کسی حد تک شاکی بھی رہے اور یہ بات بھی دلچسپ ہے اور غور طلب بھی کہ اسی علی گڑھ میں ۱۸۹۶ء میں شعبۂ نسواں کھل جانے کے باوجود حرکت میں نہ آسکا اور وہ شعبہ اور تحریکِ نسواں **سرسید** کے انتقال (۱۸۹۸ء) کے بعد سے شروع ہوئی ہے۔ کوئی تو بات ہے کہ پروفیسر **رفیعہ سلطانہ** اپنی کتاب اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ ، میں ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے **نذیر احمد** سے **راشد الخیری** کا ذکر کرتی ہیں لیکن **سرسید** کا کہیں ذکر نہیں کرتیں۔ **مولانا عبدالحلیم شرر** نے بھی **سرسید** سے ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ تعلیمِ نسواں کے حامی نہ تھے۔ زیادہ ذکر کیا جاتا تو خاموش ہو جایا کرتے۔ **سرسید** کی خاموشی، **اکبرالہ آبادی** کی ناپسندیدگی اور اکبر آباد کے بعض شعرا کی شدید مخالفت نے ماحول کو نازک اور پیچیدہ ضرور بنا دیا تھا لیکن وقت کی رفتار ضرورت اور حقیقت کا اپنا ایک جادو ہوا کرتا ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ **سرسید** کے ہی رفیق اور عناصرِ خمسہ کے ایک اہم عنصر اور اردو کے سب سے پہلے ناول نگار **ڈپٹی نذیر احمد** نے اپنی پوری زندگی محض عورتوں کی اصلاح اور تربیت کے لیے وقف کر دی۔

اردو ادب میں **نذیر احمد** پہلے تخلیق کار ہیں جنھوں نے باقاعدہ عورتوں کی اصلاح و تربیت کو اپنی زندگی کا واحد مقصد بنایا۔ مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) سے لے کر ایامیٰ ،اور رویائے صادقہ ،تک ان کا پورا سفر اسی مقصد کے لیے وقف رہا۔ ان کا پہلا کارنامہ تو یہ تھا کہ انھوں نے نصیحت اور تنبیہ جیسے موضوعات کو قصے کے پیرایے میں پیش کیا اور اردو میں پہلی بار ناول کی صنف کو روشناس کرایا اور پہلی بار مسلمانوں کے متوسط گھرانوں کی روز مرّہ کی زندگی، تربیتی مسائل اور بالخصوص عورتوں اور لڑکیوں کے تہذیبی و تعلیمی مسائل پر روشنی ڈالی۔ کسی ناول میں بیوہ کا مسئلہ، کسی میں شادی کا مسئلہ اور کسی میں ہنرمندی کے مسئلے کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا اور حد یہ کہ ہریالی کے کردار میں **نذیر**

احمد نے طوائف کو بڑے سلیقے سے پیش کیا۔ان ناولوں کا حسن یہ ہے کہ یہ سب کے سب انیسویں صدی کے ھندوستان اور خصوصی طور پر مسلمانوں کے گھروں کی حقیقتوں کو واضح اور پرکشش انداز میں پیش کرتے ہیں۔فنی اعتبار سے **نذیر احمد** کے ناولوں کو کمزور کہا جاسکتا ہے لیکن یہ فیصلہ آج کا ہے۔اُس وقت یہ تمام ناول دو طرح سے متاثر کر رہے تھے۔ایک تو ادب میں معاشرتی حقائق کے ساتھ **قصہ گوئی** کا نیا چلن عام ہو رہا تھا۔دوسرا عورتوں کے مسائل عام ہوئے اور ان روایات کو قبولیتِ عام کی سند ملنے لگی۔جو ان ناولوں کے بطن سے پھوٹتی تھیں۔**نذیر احمد** کے ناول اس قدر پسند کیے گئے اور تہذیبی طور پر ان کو وہ درجہ ملا کہ لڑکیوں کو جہیز میں دیا جانے لگا اور شرفا کے گھروں میں رُشد و ہدایت کی معتبر کتابوں میں اس کا شمار کیا جانے لگا۔اردو ادب میں **نذیر احمد** کئی اعتبار سے منفرد و ممتاز مقام رکھتے ہوئے اردو ناول کے بانی تو سمجھے ہی جاتے ہیں لیکن ھندوستان گیر سطح پر شدت و سُرعت سے بدلتی ہوئی صورتوں اور ان سے متاثر ہو کر تخلیق کیے جانے والے ہندوستانی ناولوں کا تجزیہ کیا جائے تو شاید اردو ادب کو یہ کریڈٹ ملتا ہے کہ اس کا پہلا ناول براہِ راست عورتوں کی اصلاح سے متعلق ہے۔ایسی صورت میں **نذیر احمد** کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔یہ سچ ہے کہ **نذیر احمد** کی اصلاح کا انداز خالص مشرقی ہے اور وہ مغربی تعلیم کی تبلیغ کرتے نظر آتے پھر بھی **سرسید** کی تحریک اور پوری ہندوستانی فضا کے تناظر میں ان ناولوں نے بڑا کام کیا اور عورتوں کی جماعت پر براہِ راست اور بے پناہ اثر ڈالا کہ دیکھتے دیکھتے عورتوں کی خاص تعداد اس ماحول میں جہاں ناول لکھنا تو درکنار پڑھنا تک خلافِ شرع سمجھا جاتا رہا ہو، باقاعدہ جنون کی حد تک پڑھنے اور کچھ ہی دنوں کے بعد لکھنے اور پھر چھپنے چھپانے کی طرف راغب ہوگئی۔

رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ عائب ،لکھ کر نام تو کمایا لیکن فسانہ بقول **خورشید الاسلام** افسانوں کا ایک جنگل ہے کی تمیز کرنا مشکل ہے کہ کون بگڑ رہا ہے کون سنبھل رہا ہے۔یہ سچ ہے کہ فسانۂ آزاد ، میں **حسن آراء، ثریا** جیسے نسوانی کردار ہیں اور ساتھ میں **کنجڑن، بھنگن** جیسے کردار بھی لیکن ان میں اصلاح کی کوئی نئی بات نظر نہیں آتی صرف ایک جگہ **حسن آراء میاں آزاد** سے اپنی خواہش ظاہر کرتی ہے:

ھماری آرزو ھے کہ ھم مدرسۂ نسواں قائم کریں۔
میں نے ایک لکچر رکھا ھے۔ یہاں آزاد اگر اصلاح

دے دیں تو میں کسی دن یہاں کی شریف زادیوں
کو جمع کرکے لکچر دوں شاید کسی کے دل پر
اثر کرے اور کوئی نتیجہ نکلے۔

اپنے ناولوں میں ذرا محنت کرتے ہیں اور اسے ایک وفادار ہندوستانی بیوی کی شکل میں ایک طرح سے اردو میں پہلی بار ایک ہندو مذہب اور سلیقہ مند عورت کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

عبدالحلیم شرر بنیادی طور پر تاریخی ناول نگار تھے لیکن انھوں نے اپنی اس تخلیقی دنیا میں **موھنا** جیسا کردار پیش کرکے ہندوستانی عورت کا آئیڈیل تصور پیش کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے عورتوں کی اصلاح اور ان کے مسائل پر باقاعدہ معاشرتی نوعیت کے ناول لکھے جس میں انھوں نے پردہ، تعلیم، عقدِ ثانی وغیرہ پر اچھی باتیں اٹھائیں۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے اہم اور ہنگامی ناول بدر النساء کی مصیبت، ہے جو پہلے حیدر آباد کے رسالے معلمِ نسواں، میں بعنوان 'پردہ میں ایسا بھی ہوتا ہے۔' شائع ہوا۔ اس ناول میں پردے کی شدت کا بھرپور مذاق اڑایا گیا ہے اور ایک سچی کہانی کے ذریعہ عورتوں کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی گئی ہے اس کے علاوہ غیب داں دلھن اور طاھرہ، جیسا ناول لکھ کر عورت کی سمجھداری اور ذہانت سے گھر کو دوزخ سے جنت میں بدلتا ہوا بھی دکھاتے ہیں۔ **شرر** باقاعدہ مولوی تھے اور مذہب کے پرستار لیکن اتنے ہی عورتوں کی تعلیم کے حامی اور پردے کے مخالف تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ۱۹۰۰ء میں باقاعدہ ایک رسالہ پردہِ عصمت، نکالا۔ اس کے علاوہ مشاہیرِ نسواں پر باقاعدہ ایک الگ سے کتاب تیار کی۔

راشد الخیری کا سارا سرمایہ بھی اگرچہ عورتوں کے مسائل کے اردگرد گھومتا ہے لیکن ان کے تمام ناولوں میں عورت کے تعلق سے مظالم، رنج وغم اور یاسیت اس قدر بھری ہوئی ہے اس میں حوصلہ، ترقی کے امکانات برائے نام ہیں اسی لیے ان کو 'مصورِ غم' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے ناول، ناول کم تبلیغ زیادہ ہیں بقول **یوسف سرمست**:

راشد الخیری اپنے ناولوں کے ذریعہ ھی کام
انجام دے رھے تھے جو اکبر الہ آبادی اپنی
شاعری کے ذریعہ کررھے تھے۔

راشدالخیری نے ۱۹۰۷ء میں عصمت، نام کا رسالہ بھی نکالا جس میں اسی طرح کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

نذیر احمد، شرر، راشدالخیری اور بعض دوسروں کی ان کوششوں کے ذریعہ اصلاحی قدم ضرور اٹھے اور ان کے ذریعہ عورتوں میں بیداری، آزادی کی کچھ شمعیں روشن ہوئیں لیکن باقاعدہ تحریک اور مشن کے طور پر اس کام کو **شیخ عبداللہ** نے کیا اور یہ کام **شیخ عبداللہ** نے اکیلے نہیں کیا بلکہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ کیا اور علی گڑھ کے نامساعد حالات میں عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں زبردست کام انجام دیے۔ **شیخ عبداللہ** جو پہلے **ٹھاکرداس** تھے **سرسید** کی عقیدت میں کشمیر سے علی گڑھ آئے۔ مسلمان ہوئے۔ وکالت پاس کی اور علی گڑھ میں ہی وکالت کرنے لگے ساتھ ہی **سرسید** کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے۔ بعض واقعات کی بنا پر طبقۂ نسواں سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں علی گڑھ میں تعلیمِ نسواں کا ایک شعبہ بنا تھا لیکن **سرسید** کی عدم دلچسپی کی وجہ سے چل نہ سکا۔ **سرسید** کی موت سے قبل **شیخ عبداللہ** نے دیگر عمائدینِ علی گڑھ سے رابطہ قائم کیا۔ اور **شیخ عبداللہ** علی گڑھ میں تعلیمِ نسواں اور شعبۂ نسواں کو متحرک کرنے اور لڑکیوں کی تعلیم عام کرنے کے لیے سرگرداں رہے۔ عین انہی دنوں آگے پیچھے اردو رسائل کی دنیا میں تین زبردست رسالے شائع ہونے شروع ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں لاہور سے تہذیبِ نسواں، جاری ہوا جس کی ایڈیٹر **محمدی بیگم** تھیں۔ حیدرآباد سے معلمِ نسواں، بھی جاری ہوتا ہے اور ۱۹۰۰ء میں جیسا کہ عرض کیا گیا **عبدالحلیم شرر** پردۂ عصمت، نکالتے ہیں۔ ان رسالوں نے بالعموم اور تہذیبِ نسواں، نے بالخصوص عورتوں میں پڑھنے لکھنے کا جذبہ عام کیا۔ یہ رسالے صرف کہانیاں یا مضامین ہی نہیں شائع کرتے بلکہ عورتوں سے متعلق بعض چھوٹی چھوٹی معلوماتی چیزیں بھی دلچسپ انداز میں شائع کرتے۔ اس سے ان رسالوں کی خریداری میں زبردست اضافہ ہوا، اور یہ رسالے گھر گھر پڑھے جانے لگے۔ عورتوں کی انجمنیں قائم ہونے لگیں۔ ان رسالوں نے ہندوستان گیر سطح پر اردو داں طبقے کے درمیان رابطہ وسلسلہ قائم کیا۔ کام کرنے کی امنگ پیدا کی اور پڑھنے لکھنے کی عادتیں ڈالیں۔

۱۹۰۲ء میں **ایڈورڈ ہفتم** کی تاج پوشی کے موقع پر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا جس میں **سرآغا** کے علاوہ **بیگم بھوپال** بھی تشریف لائیں۔

شیخ عبداللہ نے موقع غنیمت جان کر اپنے کچھ ہم خیال دوستوں کی ایک میٹنگ کی شعبۂ نسواں کو زندہ متحرک کرنے کا فیصلہ لیا اور **عبداللہ** کو شعبے کا سیکرٹری بنا دیا گیا۔ سیکرٹری بنتے ہی **عبداللہ** تن من دھن سے اس کام میں لگ گئے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

میں نے اخبارات میں مضامین لکھے اور لڑکیوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ کچھ لوگوں نے موافقت کی لیکن زیادہ تر مخالفت میں مضامین لکھے گئے۔ سب سے بڑی مخالفت پردہ کی تھی جس میں فقط مرد ھی نہیں بلکہ پرانے خیالات کی عورتیں بھی شامل تھیں۔

۱۹۰۳ء میں محمڈن ایجوکیشنل کا جلسہ بمبئی میں ہوا جس میں پہلی مرتبہ خواتین کو پردے کے پیچھے سے کانفرنس کی تقریریں سننے کا موقع ملا۔ اس کانفرنس میں **زہرہ فیضی**، **عطیہ فیضی** وغیرہ نے بھی شرکت کی۔ اس کانفرنس کے بعد ہی **شیخ عبداللہ** اور ان کی **اہلیہ** نے طے کیا کہ علی گڑھ میں باقاعدہ ایک مدرسۂ نسواں قائم کیا جائے۔

۱۹۰۴ء میں علی گڑھ کے ان دوستوں نے **عبداللہ** کی ادارت میں 'خاتون' نامی رسالہ جاری کیا جو ہزار مخالفت کے باوجود ۱۹۱۴ء تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ **عبداللہ** نے چھوٹے چھوٹے کتابچے بھی شائع کیے جس میں 'عورت کا اسلام میں درجہ' جیسے مضامین شائع ہوئے۔ **بیگم بھوپال** نے مدرسہ کھولنے کی اجازت دی اور مالی معاونت بھی کی۔ اسی سال (۱۹۰۴ء) علی گڑھ میں خواتین کی کانفرنس بھی ہوئی جس میں **عبداللہ** اور ان کے دوستوں نے بے پناہ محنت کی۔ ایسے ناہموار ماحول میں اس کانفرنس کا انعقاد ایک عجوبہ تھا جس کو دیکھ کر ہی **حالی** نے ۱۹۰۵ء میں 'چپ کی داد' جیسی نظم کہی اور **عبداللہ** اور حامیانِ تعلیمِ نسواں کو بے زبانوں کی زبان اور بے بسوں کے بازو کے الفاظ سے یاد کیا۔ **بیگم بھوپال** کو ہاتف کی آواز کہا۔

۱۹۰۷ء میں محلّہ اپرکوٹ، علی گڑھ میں ایک چھوٹے سے مکان میں اسکول کھول دیا گیا۔ سال بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد یوپی گورنمنٹ نے ڈھائی ہزار ماہوار اور ستر ہزار کی رقم عمارت کی

تعمیر کے لیے دی۔شہر سے باہر زمین خریدی گئی۔ یہاں ۱۹۱۱ء میں اس کی بنیاد رکھی گئی۔مسلمان لڑکیوں کا پہلا بورڈنگ ہاؤس تھا جس کے ایک حصہ میں پڑھائی کا انتظام تھا اور دوسرے حصے میں ہاسٹل، اتنی محنت وایثار کے باوجود **شیخ عبداللہ** اور ان کی **بیگم** کی مخالفت ہوتی رہی لیکن یہ دونوں میاں بیوی دیوانہ وار اپنے مشن میں مصروف رہے۔رفتہ رفتہ والدین کو اطمینان ہونے لگا۔دوسرے شہروں کی لڑکیاں بھی آنے لگیں۔تعداد بڑھتی گئی۔دیکھتے دیکھتے یہ مدرسہ ھائی اسکول سے **بی اے** تک پہنچ گیا پھر ۱۹۲۶ء میں یونیورسٹی سے ملحق ہوگیا۔**شیخ عبداللہ** کی غیر معمولی لگن، خاتون، رسالہ کی اشاعت، تعلیمِ نسواں کی زبردست حمایت **بیگم بھوپال** کی سرپرستی، **بیگم عبداللہ** عرف **اعلیٰ بی** کے غیر معمولی ایثار، شوہر کی رفاقت اور انتھک محنت نے اس مشن کو نہ صرف کامیاب کیا بلکہ اسے ایک تحریک میں بدل دیا۔۱۹۳۹ء میں جب **اعلیٰ بی** نے انتقال کیا تو **بابائے اردو** نے تعریف کے طور پر لکھا:

مرحومہ نے تعلیمِ نسواں کے تمہارے کالج میں
جس خلوص اور ایثار سے کام کیا وہ نہایت قابلِ
قدر ھے۔ اسے مسلمان اور خصوصاً خواتین کبھی
بھول نہیں سکتیں ان کی زندگی عورتوں اور
لڑکیوں کے لیے لائقِ تقلید ھے۔

شیخ عبداللہ نے لمبی زندگی پائی۔ساری زندگی لڑکیوں کی تعلیم بہتر سے بہتر اور جدید سے جدید تر بنانے کے لیے وقف کردی۔ان کی اس خدمت کے اعتراف میں انگریزی حکومت نے انھیں **'خان بہادر'** کا خطاب دیا۔۱۹۵۰ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف سے **ڈاکٹر آف لاز** کی اعزازی سند تفویض ہوئی۔ویمنس کالج کا عبداللہ ہال آج بھی ان کے شاندار کارناموں کی یاد تازہ کرتا ہے۔

ایک طرف **شیخ عبداللہ** اور ان کی **اہلیہ** کے خلوص وایثار بھرے یہ کارنامے تھے، دوسری طرف **نذیر احمد، شرر** وغیرہ کے ناولوں کی غیر معمولی مقبولیت۔دونوں نے مل کر ایک فضا بنائی اور دیکھتے دیکھتے تحریک کی حمایت کرنے والوں اور خواتین قلم کاروں کی ایک بھیڑ اُمڈ آئی جس نے اپنی کوششوں اور فن پاروں کے ذریعہ اس تحریک کو مزید وسعت اور تقویت دی۔ایسی خواتین قلم کاروں میں **بیگم بھوپال، محمدی**

بیگم، طیبہ بیگم، اشرف جہاں، صغریٰ ہمایوں مرزا، نذر سجاد حیدر، والدہ افضال علی وغیرہ اہم ہیں۔

تعلیمِ نسواں کی تبلیغ اور سرپرستی کے طور پر سب سے اہم نام **سلطان جہاں بیگم عرف بیگم بھوپال** کا لیا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو زبان اور تحریکِ نسواں کی قلمی اور مالی دونوں طرح سے سرپرستی کی خصوصاً عورتوں کی تعلیم میں وہ بے حد پیش پیش رہتیں۔ وہ بذاتِ خود ادیب تھیں انھوں نے باغِ مجیب، اسلام میں عورت کا مرتبہ، سیرت المصطفیٰ جیسی کتابیں لکھیں۔ **مولانا شبلی** سے فرمائش کر کے سیرۃ النبی جیسی کتاب لکھوائی۔ وہ عورتوں کی سرسید تھیں۔ انھوں نے اداروں، مدرسے، تنظیمیں قائم کیں۔ عورتوں کے سلسلے میں بڑے اہم اور تاریخی کام انجام دیے، تحریک کو تیز کیا۔

محمدی بیگم پہلی خاتون ہیں جنھوں نے تہذیبِ نسواں، نام سے عورتوں کے لیے سب سے پہلا رسالہ نکالا۔ اس رسالے میں انھوں نے عورتوں سے متعلق چھوٹے چھوٹے مسائل اور موضوعات پر لکھ کر بڑے مسائل کی طرف متوجہ کیا۔ دینی و مذہبی تعلیم کے علاوہ زندگی کو صحیح طور پر سمجھنے اور برتنے کے طریقے بنائے اور پڑھنے لکھنے کا جذبہ پیدا کیا۔ **محمدی بیگم** کی کوششوں سے دار الاشاعت بھی قائم ہوا جس کی وجہ سے خواتین کی کتابیں شائع ہونے لگیں۔ **محمدی بیگم** نے ناول بھی لکھے سگھڑ بیٹی، شریف بیٹی، بھو بیٹی، جیسے ناول غریب اور متوسط طبقے کو چھوتے ہیں۔

صغریٰ ہمایوں مرزا کو اردو کی پہلی خاتون ناول نگار کہا جاتا ہے۔ ان کا ناول زہرہ یا مشیرِ نسواں، ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول بے حد مقبول ہوا۔ موضوع کی افادیت کو دیکھتے ہوئے **سلیمان ندوی** ایک جگہ اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

> مشیرِ نسواں، آپ اپنی نظیر ہے۔ ہندوستان کی کسی مسلمان خاتون نے آج تک ایسی کتاب نہیں لکھی۔

ان کا دوسرا ناول سرگزشتِ ہاجرہ، دکن کی سوسائٹی کی اچھی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس ناول میں فرقہ پرستی کے خلاف اچھی باتیں کی گئی ہیں۔

طیبہ بیگم ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ مشہور عالم **سید حسن عماد الملک** کی اہلیہ تھیں۔ ۱۹۱۲ء میں مدراس یونیورسٹی سے **بی اے** کرنے کے بعد ۱۹۱۷ء میں آل انڈیا لیڈیز کانفرنس کی صدر منتخب ہوئیں۔ اس کانفرنس میں پڑھے گئے ان کے خطبات خاصے مقبول ہوئے۔ انھوں نے پہلے ناول بھی لکھے۔ انوری بیگم ، حشمت النساء ، احمدی بیگم مشہور ہوئے، **طیبہ بیگم** غالباً پہلی خاتون ہیں جنھوں نے ایک انگریزی ناول کا اردو میں ترجمہ کیا۔

نذر سجاد حیدر، سجاد حیدر یلدرم کی اہلیہ تھیں۔ عورتوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق عمدہ اور مضبوط خیالات ان کو وراثت میں ملے۔ انھوں نے محض ضرورت یا فیشن کے طور پر نہیں لکھا بلکہ اپنی فطری افتادِ طبع سے مجبور ہو کر بڑے سلیقے سے کئی عمدہ ناول لکھے۔ اختر النساء بیگم ، آہِ مظلومہ ، حرماں نصیب ، نجمہ ، جاں باز ، ثریا ، وغیرہ ان کے **ناول** ہیں جن میں نجمہ اور آہِ مظلومہ ، کو خاصی شہرت ملی۔ ان تمان ناولوں میں انھوں نے پوری سنجیدگی سے الگ الگ موضوعات پر بڑے دلچسپ انداز میں مختلف نسواں مسائل پر طبع آزمائی کی۔ ان کے بیشتر مضامین تہذیبِ نسواں ، زمانہ ، نگار اور خاتون ، میں چھپتے تھے۔ ان کا روزنامچہ بہت مقبول ہوا۔ بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی لکھیں اور ساتھ ہی پھول ، نام کا ایک رسالہ بھی نکالا۔

عطیہ فیضی اردو کی پہلی مسلم خاتون ہیں جو تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن گئیں، سرکاری وظیفہ حاصل کیا۔ اپنا سفر ڈائری کی شکل میں لکھا۔ **عطیہ فیضی** موسیقی کی بہت دلدادہ تھیں اور باقاعدہ مہارت رکھتی تھیں۔ ان کے کئی مضامین موسیقی کے فن پر بھی ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ **اشرف جہاں** والدہ **افضال علی**، **انور حسن** وغیرہ جیسی خاتون نے بھی اپنے اپنے انداز سے لکھا۔ **اظ حسن** کا ناول روشنک بیگم اور **اشرف جہاں** کا ناول فنانِ اشرف خاصے مقبول ہوئے۔

ان خواتین کے ناولوں کی اشاعت اور شہرت نے بعض خواتین کو افسانہ نگاری کی طرف متوجہ کیا۔ حالانکہ کہانی کہنے سننے کا مزاج عورتوں میں ہمیشہ سے رہا ہے لیکن لکھنے کی طرف دھیان بعد میں گیا۔ **مسز عبدالقادر، حجاب امتیاز علی** کے افسانے اس لہر اور مزاج کے اولین افسانے سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد باقاعدہ مجموعے بھی منظر عام پر آئے۔ **مسز عبدالقادر** کے افسانوی مجموعے لاشوں کا شہر ، راہبہ ، صدائے جرس ، خوب مقبول ہوئے۔ **حجاب امتیاز علی** نے ابتداً رومانی افسانے

لکھے۔لیکن آگے چل کر انھوں نے جاسوسی اور ہیبت ناک افسانے بھی لکھے جو خاصے مقبول ہوئے۔ان کا افسانہ 'مہمان داری' اچھی شہرت کا مالک ہوا۔

متذکرہ خواتین کے تخلیقی فن پاروں کا عمومی جائزہ صاف بتاتا ہے کہ سارے ناولوں اور افسانے شعوری یا لاشعوری طور پر مسلم کرداروں اور مسلم گھرانوں کے مسائل کے ہی اردگرد گھومتے ہیں۔ پچاس سال قبل **نذیر احمد** نے بھی یہی کام انجام دیا اور پچاس سال بعد خواتین اگرچہ سرگرم رہیں اور پورے ماحول میں روح پھونکتی رہیں لیکن صدیوں کی قید و بند بود و باش اور روایتی طرزِ فکر نے انھیں گھر سے باہر کے مسائل کی طرف متوجہ نہ کیا اور ان کے ناولوں **نذیر احمد** کے ناولوں کہیں دوسری کہیں تیسری کاپی بن کر رہ گئے۔ان تمام عورتوں کی تخلیقی کوششوں سے صورت یہ پیدا ہوئی کہ چھوٹے موٹے خواتین قلم کاروں کی ایک بھیڑ سامنے آئی جس نے زندگی کے تمام چھوٹے بڑے موضوعات پر اپنے اپنے ڈھنگ سے لکھنا شروع کیا۔ہندوستان گیر سطح پر عورتوں کی اصلاحی انجمنیں، لیڈیز کلب، اداروں بلاتفریق مذہب وملت اپنا کام کرنے لگے۔

نذیر احمد کے قلم سے ڈالی گئی بنیاد اور **شیخ عبداللہ** کے علم وعمل اور ایثار و جاں فشانی سے لگایا ہوا یہ پودا بدلتی ہوئی ہواؤں سے بارآور ہوا،اور ۲۵-۱۹۲۴ء تک پہنچتے پہنچتے تحریکِ نسواں اپنے پورے اغراض ومقاصد کے ساتھ ملک گیر سطح پر رواں دواں تھی۔اس کے ساتھ ہی آزادی کی لہر بھی تیز ہوتی رہی اور اگر یہ کہا جائے کہ ملک کے اس سیاسی ماحول اور **تحریکِ آزادی** نے **تحریکِ نسواں** کے فروغ اور نشوونما میں خاصی مدد کی تو غلط نہ ہوگا۔

تحریکِ نسواں سے متعلق بعض رسالوں میں جنگِ آزادی کی گرما گرم خبریں بھی چھپتی رہتی ہیں لیکن مسلم خواتین سے متعلق ایسی کوئی خبر یا مضمون کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا۔جولائی ۱۹۳۰ء میں **شیخ عبداللہ** کا ایک مضمون 'ہندوستان کی آزادی میں عورتوں کی آزادی' شائع ہوا جس میں انھوں نے **گاندھی جی** کی کوششوں کو سراہا ہے اور عورتوں سے متعلق ان کی حوصلہ افزا رائے کو پیش کیا ہے۔

اردو زبان وادب میں ایک وقت تھا جب عورتوں کا پڑھنا لکھنا خلافِ شرع وخلافِ تہذیب سمجھا جاتا تھا۔آج **رشید جہاں**، **عصمت چغتائی**، **قرۃ العین حیدر** کا تخلیقی سرمایہ اردو والوں کے لیے

باعثِ افتخار ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اتنا لمبا سفر طے کرنے اور ترقی کرنے کے باوجود مسئلے آج بھی بے پناہ ہیں۔ عورت آج بھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں استحصال کا شکار ہے۔ گزشتہ برسوں میں شائع شدہ ڈاکٹر **رشید جہاں** پر تخلیقی مقالہ لکھتے ہوئے ڈاکٹر **شاہدہ بانو** نے ابتدا میں یہ کہا:

> ایک خاتون کی حیثیت سے میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ عورت آج بھی کسی نہ کسی شکل میں مجبور ہے۔ پابندیاں اور بیڑیاں آج بھی ہیں۔

داستان تاریخِ اردو

پورب کے مشاہیرِ ادب

[علامہ شبلی کے خصوصی حوالے سے]

اقبال سہیل

مولوی حامد حسن قادری بچھرانوی پروفیسر سینٹ جانسن کالج (آگرہ) کی جدید تالیف: داستانِ تاریخ اردو ، میری نظر سے گزری یہ تالیف ہر حیثیت سے نہایت قابلِ قدر اور ادبِ اردو میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ نثرِ اردو کی تدریجی ترقی اور نشو ونما پر اب تک ہماری زبان میں کوئی جامع، ترتیب اور ناقدانہ تالیف شائع نہیں ہوئی۔ **نواب نصیر حسین خاں خیال** کی تالیف: داستان اردو ، ابھی پوری نہیں چھپی۔ صرف ایک حصہ مغل اور اردو ، کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کی تدوین اور اشاعت سے مؤلف نے بڑی کمی پوری کر دی ہے اور محض ۵۲ صفحات میں غالباً لاکھوں صفحات کے مطالعے کا نچوڑ یکجا کر دیا ہے۔ اس تالیف کا جو حصہ تنقیدی ہے، وہ بھی باوجود اختصار بڑی حد تک متوازن اور منصفانہ ہے۔ جناب مؤلف کو ان کے اس شاہ کار پر جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ ادرار دو میں غالباً یہ اپنی نوعیت کی پہلی کامیاب کوشش ہے۔

اس طرح کی تالیف تسامحات سے ایک لخت خالی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اس تالیف میں بھی بعض فروگزاشتیں ہوگئی ہیں، جن کی طرف مولف کوتوجہ دلانا، میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

جناب مؤلف غالباً ضلع مراد آباد کے رہنے والے ہیں۔ آگرہ میں قیام ہے۔ان حالات میں مشرقی اضلاع کے اکثر اہلِ قلم یا ان کے نتائجِ افکار کا تذکرہ نہ کرنا محلِ تعجب ہے، نہ قابلِ گرفت پھر بھی تالیف کی جامعیت متقاضی تھی کہ پورب کے چند مشاہیرِ ادب جنھوں نے واقعتاً اردو کی بڑی خدمت انجام دی ہے، نظر انداز نہ کیے جاتے۔ مثلاً حضرت **مولانا شہید** رحمۃ اللہ علیہ کے رفقائے کار اور **مولانا سید شہید بریلوی** رحمۃ اللہ علیہ کے نامور خلفا **سخاوت علی فاروقی** اور **مولانا کرامت علی** مرحومین جو جونپور کے اکابر علما و مشائخ میں تھے، بہ حیثیت خادم اردو علمائے خیر آباد سے کسی طرح فروتر نہ تھے۔ یہ صحیح ہے کہ خدمتِ ادب ان بزرگوں کا مقصود نہ تھا، بلکہ ان کے تمام مساعی کا محور ہدایتِ خلق تھی اور اشاعتِ حق تھا۔ مگر خود یہی مقصد خدمتِ اردو کا محرک ہوا، اور مجبوراً ان بزرگوں کو عام فہم اردو میں کتابیں لکھنی پڑیں۔ ازاں جملہ **مولانا سخاوت علی مرحوم** کا رسالہ تقویٰ، اور **مولانا کرامت علی** کی مفتاح الجنۃ، مذہبی دنیا میں بہت دنوں تک مقبول و متداول رہیں۔

اسی دور کے لگ بھگ یا کچھ مابعد زمانہ کے نہایت بلند پایہ اردو مصنف **مولانا لطف اللہ غازی پوری** مرحوم تھے، جن کا ایک عجیب و غریب کارنامۂ ادب تخمیناً آٹھ سو صفحات میں 'سورۂ فاتحہ' کی تفسیر مظہر العجائب' ہے۔ یہ تفسیر دراصل ایک مجتہد صاحب کی تفسیر موسومہ توضیع المجید' کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ تفسیری مطالب کے ضمن میں مناظرانہ مباحث کو اس خوبی سے سمو دیا ہے کہ کہیں سے آورد نہیں معلوم ہوتی۔ عالمانہ نکتہ آفرینی کے ساتھ ظریفانہ بذلہ سنجی اور ادیبانہ شوخی کے ساتھ خطیبانہ بلند آہنگی اس ترتیب اور توازن کے ساتھ دست و گریباں ہے کہ معاند کی زبان سے بھی بے اختیارانہ آفرین نکل جاتی ہے۔

پوری کتاب مقفیٰ و مسجع ہے اور قدم قدم پر استخراجِ مادۂ تاریخ کے عجیب و غریب نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ باایں ہمہ اندازِ بیان شروع سے آخر تک شگفتہ ہے اور التزامِ ضائع نے عبارت کی روانی یا استدلال کی ترتیب و قوت میں کوئی کمی آنے نہیں دی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کی دینی بے حسی نے اس کتاب کو دوبارہ چھپنے کا موقع نہیں دیا اور میرے پاس جو قدیم مطبوعہ نسخہ تھا، وہ غالباً کسی قدر شناس کے

ہاتھ پڑ گیا۔ ورنہ میں اس موقع پر اس کے کچھ اقتباسات پیش کرتا۔

سرسید کے ہم عصر بلکہ استاد اور تحقیقاتِ علمی میں ان کے خضرِ راہ **مولانا عنایت رسول چریاکوٹی مرحوم** تھے جو اپنے وقت کے بحرالعلوم اور بڑے پایہ کے مصنف تھے۔ **سرسید** کی خطبات احمدیہ، کا بیش تر حصہ دراصل **مولانا عنایت رسول** کی بے مثل تصنیف 'بُشریٰ'، سے ماخوذ ہے۔

اسی خاک چریا کوٹ کے ایک جوہرِ قابل **مولانا ابوالفضل احسان اللہ عباسی مرحوم** وکیل گورکھپور تھے، جنھوں نے شباب سے آخر عمر تک تراجم کے علاوہ اردو ادب کی خدمت کی ہے اور تراجم کے علاوہ مختلف فنون میں متعدد ضخیم تالیفات چھوڑی ہیں۔

علامہ شبلی کے ہم عصروں میں **مولوی وکیل احمد سکندر پوری مرحوم** اور **مولوی عبدالغفور فاروقی محمد آبادی مصنف** معارج الکلام بھی محسنین اردو میں قابلِ ذکر تھے۔

ممکن ہے کہ افقِ مشرق کے ان ستارہ ہائے سحری کی شعاعیں دیارِ مغرب تک نہ پہنچ سکی ہوں۔ مگر کیا اردو کا کوئی ذوق آشنا گورکھپور کے مایۂ ناز ادیب **مہدی حسن** افادی الاقتصادی سے بھی بے خبر رہ سکتا ہے، جس کے نظم کی گلفشانیاں صلائے عام اور نقاد، کے صفحات کو مدتوں تک چمن زار بناتی رہیں۔ مرحوم ایک مخصوص اندازِ نگارش کے موجد تھے، جس کی تقلید ناممکن ہے۔ ان کے مختلف مضامین کا مجموعہ: افاداتِ مہدی' کے نام سے ان کی **بیگم صاحبہ** نے پہلے شائع کیا تھا اور اب ان کے مکاتیب بھی شائع ہو گئے ہیں۔ **مہدی حسن مرحوم علامہ شبلی** کے مخصوص احباب اور پایہ شناسوں میں تھے اور چونکہ بجائے خود صاحبِ طرز تھے، اس لیے **مولانا مرحوم** نے بھی ہمیشہ ان کے ادبی کمالات کا اعتراف کیا۔ اگر ایڈیٹر صلائے عام 'اہلِ زبان تھے تو یقیناً **مہدی حسن مرحوم** زباں آفریں تھے، صلائے عام (دھلی) اور نقاد (آگرہ) کا آب و رنگ بہت کچھ **مہدی حسن مرحوم** کی رنگین نوائی کا رہینِ منت تھا۔ اس وجہ سے ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ جناب مؤلف **مہدی حسن مرحوم** کے نام سے ناآشنا ہوں۔ ان حالات میں داستانِ تاریخِ اردو ' کا اس بلبلِ ہزار داستان کے نغموں سے خالی ہونا یا تو اس وجہ سے ہے کہ مرحوم اضلاعِ مشرقی کے باشندے تھے یا شاید ان کو بیسویں صدی کے ادیبوں میں شمار کر لیا گیا ہے اور ان کا تذکرہ آئندہ کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے۔ حالاں کہ **مہدی مرحوم** یقیناً انیسویں صدی کی پیداوار تھے اور ان کا علمی نشو و نما بھی اسی صدی میں ہو چکا تھا۔

خود اپنے صوبے کے اندر پورب والوں سے جب یہ بے اعتنائی برتی گئی ہے تو بھار وبنگال کے مصنفین اور ادبا مثلاً **راسخ عظیم آبادی، مولانا عبدالحمید عظیم آبادی، مرحوم میر علی محمد شاد، نواب سید محمد آزاد، پروفیسر شہباز اور نواب نصیر حسین خاں خیال** اگر اس ''داستانِ اردو'' میں فراموش کر دیے گئے ہیں تو شکوے کا کیا محل ہے۔

یہی نہیں اضلاعِ مغربی کے بھی چند قابلِ ذکر ادیب نذرِ طاقِ نسیاں ہو گئے ہیں۔ **مولوی عبدالرزاق کانپوری** مصنف: ''البرامکہ'' اور **مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی** مستقلاً نہ سہی ضمناً ضرور درخورِ اعتنا تھے۔

اسی طرح جدید تعلیم یافتہ بزرگوں میں بھی دو ادیب یقیناً قابلِ ذکر تھے۔ **ایک تو سجاد حیدر یلدرم** اور دوسرے **سید محفوظ علی نقاش بدایونی**۔ یہ دونوں صاحبان خاص طرزِ انشا کے مالک ہیں اور عرصے تک اردو کی ادبی خدمت کرتے رہے ہیں۔ سنجیدہ ظرافت میں تو اب تک غالباً اردو کا کوئی ادیب **سید محفوظ علی** کا ہم رتبہ نہیں ہو سکا۔ یہ لوگ **مولانا حمید الدین مرحوم** اور **ظفر علی خاں** صاحب کے ہم درس رہ چکے ہیں اور **علامہ شبلی** کے فیض یافتہ ہیں۔ اس لیے شاید جناب مصنف ان کو بھی بیسویں صدی کے ادیبوں میں شمار کرتے ہوں۔ مگر اس صورت میں **ظفر علی خاں** صاحب یا **مولانا ابوالکلام آزاد** کو بھی آئندہ کے لیے اٹھا رکھنا چاہیے تھا۔

مغرب و مشرق کا نقطۂ اتصال اودھ ہے۔ مگر یہاں بھی ایک قابلِ ذکر ادیب کے تذکرے سے تغافل کیا گیا ہے۔ **مولانا سید عبدالحیٔ مرحوم** ناظم ندوۃ العلماء جو ایک نہایت مستند تذکرۂ شعرا کے مصنف ہیں اور مدتوں تک حضرت الاستاذ **علامہ شبلی** کے رفیقِ کار رہ چکے ہیں، کم سے کم چند سطروں کے ضرور مستحق تھے۔ فاضل مؤلف کے وسعتِ قلب کا تو یہ عالم ہے کہ **ناصر نذیر صاحب** نے **فراق دہلوی** پر بھی پورے دو صفحے صرف کر دیے ہیں اور ضمناً **حسن نظامی** اور **ملا رموزی** تک کو اس بزمِ ادب میں باریابی دے دی ہے۔ **مولانا سید عبدالحیٔ مرحوم** کم سے کم اس فہرست میں تو آ جاتے، مگر غالباً ان پر نگاہِ انتخاب یوں نہیں پڑی کہ وہ **حضرت سید احمد شہید** رحمۃ اللہ علیہ کے اسباط میں تھے، جن کو فاضل مصنف نے **داستان میں فرقۂ وہابیہ** کا بانی لکھا ہے۔

یہ تاریخی غلط بیانی شاید قادریت کی **عصبیت** ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں

مشکل سے مشکل کوئی شخص وہابی عقیدے کا مل سکے گا۔ **فرقۂ وھابیہ سیدنا محمد بن عبدالوہاب نجدی** رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب ہے۔ یہ بزرگ نشاۃِ ثانیہ عربیہ کے محرکِ اول اور فقہ **حنبلی** کے متبع تھے اور آج بھی **وہابی** اور **نجدی** حضرات فقہ **حنبلی** کے پیرو ہیں۔ **حضرت سید احمد بریلوی** اور ان کے کل رفقا فقہ حنفی کے مقلد تھے اور تصوف میں زیادہ تر سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کی تعلیم دیتے تھے۔ معاندین بلاوجہ شکل ان بزرگوں کو بدنام کرنے کے لیے **وہابی** کہتے ہیں۔ مگر اس جماعت کے کسی فرد نے آج تک اپنے کو **وہابی** نہیں کہا، نہ **وہابیوں** نے ان کو اپنی جماعت میں شامل سمجھا۔ وہابیت کو تصوف سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ اس کے برخلاف **سید احمد شہید** رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تمام خلفا علمِ باطن سے بہرہ ور تھے۔ خود **مولانا اسماعیل شہید** رحمۃ اللہ علیہ کی منصبِ امامت اور صراطِ مستقیم، حقائقِ تصوف میں نہایت بلند پایہ کتابیں ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس جماعت کے لوگ اتباعِ سنت اور اجتناب عن البدعات میں بہت متشدد تھے۔ چنانچہ بعد کو اس جماعت کے بعض متبعین غیر مقلد یا اہلِ حدیث ہو گئے ہیں، جن میں سب سے زیادہ پیش پیش **نواب صدیق حسن خاں مرحوم**، **مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی** منصف حسن البیان اور شمس العلماء **مولانا نذیر حسین دہلوی مرحوم** تھے۔ اول الذکر بزرگ کثیر التصانیف ہونے کے علاوہ علم وادب کے بہت بڑے سرپرست تھے۔ بھوپال میں **نواب صاحب مرحوم** کا دور اقتدار درحقیقت اسلامی علوم اور زبانِ اردو کا عہدِ بہار تھا۔

محسنینِ اردو میں **نواب صاحب مرحوم** کی امتیازی حیثیت سے انکار ناممکن ہے اور اردو کے متعلق کسی تاریخ یا تذکرے کا ان کے ذکر سے خالی ہونا ایک فروگزاشت ہے جو مذہب ادب میں قابلِ تعریز شمار کی جاسکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ **نواب صاحب** نے زیادہ تر کتبِ احادیث وسیر کے ترجمے شائع کرائے لیکن داستان تاریخ اردو کے مؤلف نے زبانِ اردو میں مذہبی تصنیفات کی اشاعت کو نظر انداز نہیں فرمایا ہے۔ ص: ۳۳۹ سے لے کر ص: ۳۸۰ تک جس حیثیت کے مصنفین کا ذکر ہے ان میں بلاشبہ **نواب صاحب** کا نام سرِفہرست ہونا چاہیے تھا اور **خلیفہ محمد حسین** مصنف: مجاز التنزیل، **مولانا محمد قاسم دیوبندی**، **مولوی عبدالحق حقانی** قابلِ تذکرہ تھے۔

یہ مسامحہ جس کی طرف سطورِ بالا میں مختصراً، اشارہ کیا گیا ہے محض سہلی ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اشخاص کا انتخاب اس طرح کی تالیفات میں زیادہ تر مصنف کے رجحان پر منحصر ہوتا ہے۔ استیعاب

اور استقصا نہ تو ممکن ہے نہ ضروری اور نہ مؤلف کو اس سلسلہ میں موردِ الزام قرار دیا جا سکتا ہے۔ میرا مقصد ان معروضات سے صرف اس قدر ہے کہ مذکورہ بالا محسنینِ ادب کی طرف مؤلف کی توجہ مائل کردوں۔ تا کہ اگر یہ مسامحہ واقعتاً مسامحہ ہو یعنی ارادۃً نہ ہو تو آئندہ اشاعت میں اس تالیف کا دامنِ معلومات وسیع تر ہو جائے۔ اب میں جناب مؤلف کی توجہ چند ایسے تسامحات کی جانب مائل کرنا چاہتا ہوں جو ایجابی نوعیت کے ہیں اور جن کے قائم رہ جانے سے آئندہ غلط فہمی کا امکان ہو سکتا ہے۔

ایک مسامحہ بیانِ واقعہ میں ہے اور خود میری ذات سے متعلق ہے، **خطوطِ شبلی** کے اقتباسات میں **قطعۂ** ذیل جناب مؤلف نے نقل کیا ہے:

کھینچ سکتا جو نہ تھا مجھ کو کوئی اپنی طرف
اس لیے مجھ کو قرابت سے بہت دوری تھی
آرٹسٹ آپ ہیں اور حسن کی تصویر ہوں میں
آپ نے کھینچ لیا مجھ کو تو مجبوری تھی

اس کے بعد میرا، ایک قطعہ اور ایک شعر نقل کرنے سے پہلے جناب مؤلف نے حسبِ ذیل عبارت لکھی ہے:

علامہ نے یہ قطعہ عطیہ بیگم کو بھیجنے کے علاوہ اپنے احباب کو بھی سنایا ہوگا اور اسی زمانہ میں مشہور ہوگیا تھا۔ جب علی گڑھ کالج میں پہنچا تو ایک ذہین وظریف طالب علم مولوی اقبال احمد صاحب سہیل (جو اب ایم اے، ایل ایل بی وکیل اعظم گڑھ ہیں) نے اس کے جناب میں یہ قطعہ لکھا۔

اس عبارت سے بظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت **علامہ مرحوم** سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے اور جس زمانے میں **مولانا** نے **قطعۂ** مذکورہ بالا لکھا میں علی گڑھ کا طالب علم تھا۔ **مولانا** کا **قطعہ** عام شہرت کی بنا پر علی گڑھ پہنچا اور میں نے ادبی بذلہ سنجی یا تعریض کے طور پر **علامہ مرحوم** کے جواب میں

دوسرا قطعہ لکھا۔ حالانکہ واقعات میں سے ایک بھی صحیح نہیں ہے اور صورتِ واقعہ اس سے بالکل مختلف بلکہ ایک حد تک متضاد ہے جو کسی قدر تفصیل اور تمہید کی محتاج ہے کیونکہ واقعے کی پوری تصویر سامنے لانے کے لیے پس منظر پیش کرنا ضروری ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں مجھ کو خود اپنی کتابِ زندگی کا ایک ورق پیش کرنا پڑ رہا ہے لیکن رفعِ مغالطہ کے خیال سے یہ زہر کا گھونٹ پی رہا ہوں اور ناظرین سے معذرت کا خواہاں ہوں۔

علی گڑھ طالب کالج میں میری طالبِ علمی کا زمانہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک رہا ہے لیکن آستانۂ شبلی کی خاک روبی کا شرف مجھ کو ۱۸۹۸ء میں حاصل ہو چکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ مرحوم علی گڑھ سے قطع تعلق کا ارادہ کر چکے تھے اور اعظم گڑھ کا گوشۂ گمنام مرحوم کے مستقل قیام کی بدولت قبلۂ اربابِ نظر ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں علامہ مرحوم ہمہ تن مطالعہ اور تصنیف میں مشغول تھے درس و تدریس کے لیے ان کے پاس وقت نہ تھا، نہ وہ اس شرف کو عام کرنے پر آمادہ تھے۔ اس ناچیز کی یہ مخصوص خوش نصیبی تھی کہ حضرت علامہ نے اپنے حلقہ بگوشوں میں شمول کی عزت عطا کی۔ بدقسمتی سے چند ہی دنوں کے بعد مولانا حیدر آباد چلے گئے اور عرصے تک سلسلۂ تعلیم بند رہا۔ آستانۂ شبلی کا غلام پھر اور کہاں جا سکتا تھا:

حیف باشد گر فرود آید پس ازوے پیش کس
کایں سرِ شوریدہ ام بر آستانے بودہ است

یہ باضابطہ تلمذ قلیل المدت اور صرف عربی کی درسیات تک محدود تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آج علم و ادب کا جو سرمایہ اس ناچیز کے پاس ہے، وہ سب کا سب اسی آستانے کا فیض ہے۔ لوگوں کو بساطِ شبلی کی حاشیہ نشینی نصیب ہوئی ہے، وہی جان سکتے ہیں کہ تشنہ کامانِ طلب کے لیے علامہ کی صحبت کا ایک لمحہ بھی کسی دوسری جگہ کے درسِ صد سالہ سے زیادہ قیمتی تھا۔

ز شبلی کردہ ام دریوزہ فیض نغز گفتاری
مرا زیبدا گر روح القدس راہم زباں دارم
بہارِ نطقِ من صد سنبلستان در بغل دارد
کہ سیرابی زرشح فیض سحبان زماں دارم

زمانۂ تلمذ میں **مولانا** کو اس کا گمان بھی نہ تھا کہ شعر کہتا ہوں یا کہہ سکتا ہوں۔ نہ میری یہ جرأت ہوسکتی تھی کہ ان کے سامنے شعر پڑھوں یا اپنے نتائجِ افکار کو ان کی خدمت میں پیش کروں۔ **علامہ مرحوم** کے حیدر آباد تشریف لے جانے کے بعد میرے ماموں نے عنفوانِ شباب میں وفات پائی اور عالمِ حزن میں بے اختیارانہ میرے قلم سے چند نالہائے موزوں ایک فارسی مرثیے کے شکل میں نکل گئے۔ میں اس وقت زیادہ سے زیادہ ۱۳، ۱۴ برس کا تھا۔ میری جرأت اعظم گڑھ کے مختصر تعلیمی حلقے میں غیر معمولی جودت متصور ہوئی اور اکثر بزرگوں نے مرثیے کی نقلیں لیں۔ انہی میں ایک بزرگ **منشی قدرت علی خان لکھنوی** مرحوم تھے، جو اعظم گڑھ سے ایک ہفتہ وار اخبار لبرل نکالا کرتے تھے۔ مرحوم نے میرے استرضا کے بغیر وہ مرثیہ شائع کر دیا۔ اس پر طُرّہ یہ کہ میرے نام کے ساتھ شاگردِ **علامہ شبلی نعمانی** کا خطاب اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ حالانکہ شاعری میں **مولانا** یا کسی سے تلمذ کا شرف مجھے حاصل نہ تھا۔ نہ فنِ عروض سے کوئی واقفیت تھی۔ اس وجہ سے قدرتی طور پر مجھے خوف پیدا ہوا کہ **علامہ شبلی** اس نظم کی اشاعت کا ذمہ دار مجھی کو قرار دیں گے اور خطابِ شاگردی کو میری خودستائی اور گستاخی پر محمول فرمائیں گے۔ چنانچہ جب **مولانا** حیدر آباد سے وطن تشریف لائے تو میں بر بنائے خوف حاضرِ خدمت نہ ہوا۔ آخر **علامہ مرحوم** نے خود بلا بھیجا اور خلافِ توقع بجائے زجر و توبیخ کے حوصلے سے زیادہ میری ہمت افزائی فرمائی اور بلا اصلاح فکرِ سخن کی اجازت دے دی۔ اس غیر متوقع تحسین سخن شناس نے میری ہمت بہت بڑھا دی اور میں زیادہ تر فارسی اور کبھی کبھی اردو میں آزادانہ شاعری کرنے لگا۔ **مولانا** جب کبھی اعظم گڑھ تشریف لاتے تو صبح سے شام تک حاضرِ خدمت رہتا اور اس خرمنِ فیض سے بہ قدرِ وسعت دامنِ خوشہ چینی کرتا۔

اس اثنا میں **مولانا** کئی بار حیدر آباد آئے گئے اور بالآخر شعر العجم، کے دورانِ تصنیف میں ایک اتفاقی واقعے سے **مولانا** کا ایک پاؤں شہید ہوگیا۔ میں اس وقت اپنے گاؤں میں تھا۔ دو تین دن بعد خبر ملی تو حاضرِ خدمت ہوا۔ **مولانا** نے مجھے آبدیدہ دیکھ کر فرمایا: "یہ کیا بزدلی ہے، مسلمانوں کے اسلاف تو وہ تھے کہ معرکۂ جہاد میں ایک پاؤں کٹ جاتا اور خبر نہ ہوتی، نہ ان کے جوشِ جہاد میں کوئی فرق آتا۔" اس کے بعد **غالب** کا یہ شعر پڑھا:

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

دوسرے دن جب پھر حاضرِ خدمت ہوا تو **مولانا** نے ایک رباعی سنائی، جس کا دوسرا شعر حسبِ ذیل ہے:

یعنی کہ پہنچ گیا ہوں جس منزل تک
یاں سے سفرِ عدم بس اب آسان ہے

یہ رباعی سنتے ہی میرے ذہن میں ایک خیال وارد ہوا، جو فوراً موزوں بھی ہو گیا۔ میں نے یہ **قطعہ مولانا** کو سنایا:

شکستہ پائی جس قدر تھی سر نوشت میں تھی
لگے گا ہاتھ نہ کچھ اب تو ہاتھ ملنے سے
عدم کی دور سی منزل نہ جاسکیں گے حضور
چلے گا قوم کا کام آپ کے نہ چلنے سے

مولانا نے یہ **قطعہ** بہت پسند کیا اور حکم دیا کہ الندوہ، میں اشاعت کے لیے بھیج دوں، یہ **قطعہ** لکھنے بیٹھا تو چند رباعیاں ذہن میں آئیں، جو حسبِ ذیل ہیں:

صدحیف ہوا شکستہ پائے شبلی
اب سلسلۂ سفر بھی مسدود ہوا
مشتاقِ زیارت جو ہو خود آئے یہاں
رہبر جو تھا اب کعبۂ مقصود ہوا

○

اللہ نے آپ کو جو ممتاز کیا
ہر وصف میں بے نظیر و انباز کیا
باقی تھا فقط فخرِ شہادت ملنا
اک پاؤں کو اس سے بھی سرفراز کیا

○

اے آنکہ تو اہلِ علم را ملجائی
حق دادہ ترا بہ ملکِ فن دارائی
چونیست کسے ہمسر تو در پایہ
پس پائے تراہمی سزد یکتائی

○

اے سردار قوم و فخر ابنائے زماں
اے علم و کمال بر وجودت نازاں
یک پائے تو چوں شد بہ عدم دانستم
زیر قدم تو شد کنوں ہر دو جہاں

اس خیال کو دوسری رباعی میں اس طرح موزوں کیا تھا:

کچے نہ غمِ شکست پا مولانا
اس میں بھی تھی حکمت خدائے دانا
تھی اہلِ عدم کو آرزوے پابوس
اک پاؤں وہاں بھی چاہیے تھا جانا

یہ بھی استاد مرحوم کی قدر نوازی تھی کہ ان رباعیات کو غیر معمولی اہمیت دی اور مہینوں تک احباب سے ان کا تذکرہ فرماتے رہے۔ عنفوانِ شباب کی عمر، اس پر ایک اتنے بڑے امامِ فن کی قدر شناسی، اس کرم نے مجھ کو اور گستاخ کر دیا۔ اکثر نکاتِ ادب کے متعلق **مولانا** سے گفتگو رہتی اور کبھی کبھی اختلافِ رائے کا بھی ادب کے ساتھ اظہار کر دیتا۔ چنانچہ جس روز **مولانا** نے **عطیہ** کی شادی پر مبارک باد کا خط لکھا، میں شبلی منزل میں حاضر تھا۔ **مولانا** نے وہ **قطعہ** مجھ کو سنایا اور لکھنے کی میز سے اٹھ گئے۔ مجھے موقع ملا تو کاغذ کی ایک چٹ پر 'جائے استاد خالی است' کے عنوان سے حسبِ ذیل **قطعہ** لکھ کر **مولانا** کی میز پر رکھ دیا اور گھر چلا آیا:

کب یہودی سے عطیہ! عقد زیبا تھا تمھیں
بنتِ فیضی تم ہو، یہ رشتہ نہ کرنا تھا تمھیں

میں نے یہ مانا وہ 'مانی' ہے تو تم تصویرِ حسن
تم کو کھنچنا تھا مصور نے جو کھینچا تھا تمہیں

شام کو جب پھر حاضرِ خدمت ہوا تو مولانا مسکرائے اور فرمایا ابھی تک تمہاری مولویانہ تنگ نظری نہیں گئی۔ اس پر میں نے شوہرِ عطیہ کی جانب سے یہ شعر لکھ کر پیش کیا:

صفحۂ دل پر جو کھینچی آپ کی تصویرِ حسن
مستحق تھا جس عطیہ کا وہ میں نے پالیا

اس واقعے کے کئی برس بعد ۱۹۱۴ء میں میرا داخلہ علی گڑھ کالج میں ہوا۔ اسی سال **علامہ مرحوم** نے وفات پائی۔ دوسرے سال کالج کے سالانہ مشاعرے میں **عارف ہنسوی** اور **شاہ دلگیر اکبرآبادی** مرحومین سے ایک صحبت میں ضمناً واقعات مذکورہ بالا کا تذکرہ ہوا۔ ممکن ہے **دلگیر مرحوم** نے دونوں **قطعات نقاد**' میں شائع کیے ہوں۔ بہرحال اس وقت تک نہ تو خطوطِ شبلی، شائع ہوئے تھے اور نہ **مولوی عبدالحق** اور ان کے عقیدت مندوں کو اس کا موقع ملا تھا کہ ان خطوط کے پردے میں اپنے دل کا کانٹا قلم کی زبان سے نکالتے۔

دیکھتا ہوں کہ معاندین کی یہ زہرافشانیاں اپنے مقصد میں ایک حد تک کامیاب ہو رہی ہیں اور فضائے تاریخ کو روز بروز مسموم کرتی جا رہی ہیں۔ یہاں تک کہ **علامہ مرحوم** کے بعض عقیدت کیش بھی اس سے متاثر نظر آتے ہیں اور زیرِ نظر کتاب کے مولف نے بھی بعض جگہ انہی معاندین کی رائیں سنداً نقل کی ہیں۔ چنانچہ **مولانا** کے مذہب پر بحث کرتے ہوئے **خواجہ غلام الثقلین** کے ایک مضمون کا اقتباس دیا ہے۔ ستم ظریفی کی یہ آخری حد ہے۔ اگر منازلِ سلوک و عرفان میں **مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی** کا مرتبہ متعین کرنے کے لیے **مسز اینی بیسنٹ** حَکم بنائی جا سکتی ہیں تو بیشک **مولانا شبلی** کے مذہبی عقائد و اعمال پر **خواجہ غلام الثقلین** صاحب کی رائے بھی کسی وقعت کی مستحق ہو سکتی ہے۔ مگر یہاں تو رائے کی آزادی ہی معرضِ بحث میں ہے:

قاصد رقیب بودہ و من غافل از فریب
بے درد مدعائے خود اندر میانہ ساخت

علامہ مرحوم کے مخالفین میں دو بزرگ امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک **مولوی عبدالحق**

صاحب دوسرے **خواجہ غلام الثقلین**، **مولوی ظفر الملک** اور **مولوی عبدالماجد دریابادی** کی مخالفت عارضی تھی جو شاید اب باقی نہ ہو۔ **مولوی عبدالحق** صاحب نے تو بے وجہ **علامہ شبلی** کو **مولانا حالی** کا مخالف فرض کرلیا ہے اور خواہ مخواہ مرحوم سے زندگی بھر بیر خرید رکھا ہے۔ **خواجہ صاحب** کی مخالفت تو مختلف وجوہ سے حق بجانب کہی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ الفاروق ، کا مصنف اس جماعت میں جس کے رکنِ رکین **خواجہ صاحب** تھے، کس نگاہ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس پر ستم یہ کہ **مولانا مرحوم غازی اورنگ زیب** رحمۃ اللہ علیہ اور **شہنشاہ جہانگیر** کے متعلق مجتہدانہ مقالات لکھ کر شیعہ مورخین کی صدیوں کی کمائی رائیگاں کردی تھی۔ ان حالات میں اگر **خواجہ صاحب مولانا** کو 'خاکم بدھن' زندیق یا ملحد قرار دیتے تو بھی تعجب نہ تھا۔ پھر مذہبی عناد کے ساتھ ذاتی کدورت بھی شامل تھی، جس کا سبب ایک تو وہی فرضی افسانہ کہ **علامہ شبلی مولانا حالی** کے مخالف تھے۔ اس سمندناز پر ایک اور تازیانہ یہ ہوا کہ مسلم یونیورسٹی ڈیپوٹیشن کے متعلق **مولانا** کی حسبِ ذیل نظم الہلال ، میں شائع ہوئی، جس میں براہِ راست **خواجہ صاحب** پر تعریض تھی اور پوری نظم میں روئے سخن انہی کی جانب تھا۔

تھی سفارت کی جو تجویز بظاہر موزوں
اہلِ مجلس بھی نظر آتے تھے یکسر خاموش
دفعتہً دائرۂ صدر سے اٹھا اک شخص
جس کی آزادیِ تقریر تھی غارت گر ہوش
اس نے اس زور سے تجویز پہ کی رد و قدح
چونک اٹھے وہ بھی جو بیٹھے ہوئے تھے پنبہ بگوش
اہلِ مجلس نے جو بدلا ہوا دیکھا انداز
ڈر ہوا یہ کہ کہیں اور نہ بڑھ جائے یہ جوش
صدرِ محفل نے بلاکر اسے آہستہ کہا
کہ 'تو ہم شامل وفد ستی و ایں مایہ مجوش'
بادۂ جامِ سفارت نے مردِ افگن تھا
ایک ہی جُرعہ میں وہ شیر جری تھا مدہوش

اب نہ وہ طرزِ سخن تھا، نہ وہ آزادیِ رائے
نہ وہ ہنگامہ طرازی تھی نہ وہ جوش و خروش
جس کی تقریر سے گونج اٹھتا تھا اجلاس کا ہال
اب وہ اک پیکرِ تصویر تھا بالکل خاموش
سخت حیرت تھی کہ اک درہِ خاکستر تھا
وہ شرارہ جو ابھی برق تھا سے دوش بدوش
دیکھتے ہیں تو حرارت کا کہیں نام نہیں
ہوگیا شعلۂ سوزندہ بھڑک کر خس پوش
اہلِ ثروت سے یہ کہہ دو کہ مبارک ہو تمھیں
للہ الحمد ابھی ملک میں ہیں رائے فروش

اس نظم کے بعد اگر **خواجہ صاحب** نے **مولانا** کے بعض کمالات کا اعتراف کیا اور نکتہ چینی میں بھی سنجیدگی کا لب ولہجہ قائم رکھا تو یہ **خواجہ صاحب** کی انتہائی شرافت اور حق پسندی ہے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کی نکتہ چینی صحیح بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ **مولانا** کے رجحاناتِ مذہبی میں تدریجی تغیرات ہوتے رہے ہیں۔ ابتدائی فقیہانہ تقشّف نے اول متکلمانہ موشگافی کی شکل اختیار کی۔ پھر **امام غزالی** اور **مولانا روم** کی بدولت تصوف کے علمی پہلو یا بالفاظِ دیگر حکمتِ ایمانی نے دامنِ دل کے لیے سامانِ کشش پیدا کیا۔ بالآخر عشقِ **رسول** جو مولانا کا مایۂ خمیر تھا، ہر چیز پر **غالب** اور **علامہ ابنِ تیمیہ** کی بے مثل تصانیف نے اتباعِ سنت کا رنگ گہرا کر دیا۔ لیکن ان تمام مراحل میں چند معتقدات اور رجحانات علی حالہ قائم رہے۔ **حضور سرورِ عالم** اور اہلِ بیتِ اطہار کے ساتھ والہانہ شیفتگی، حنفیت و ماتردیدیت میں غلو، اشعریت سے اختلاف اور متکلمانہ مباحث میں فراخ دلی۔ انھوں نے کبھی نصوصِ شرعیہ کو مسخ کر کے عقلیت کے معیار پر لانے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن کبھی حقیقی مذہب کو عقل کا مخالف نہیں سمجھا۔ نصوصِ شرعیہ پر بلا کوشش تاویل ایمان بالغیب ان کا مسلک تھا، لیکن دینیات، فقہ اور مباحثِ کلامی میں انہی مسائل کو ترجیح دیتے تھے جو اقرب الی العقل ہوں۔

اسلافِ امت خواہ فقہا ہوں یا محدثین وہ سب کا احترام کرتے تھے۔ مگر ان میں سے کسی

ایک کو معصوم عن الخطا (نہیں) سمجھتے تھے۔ یہ غلط ہے کہ **مولانا** نے **امام بخاری** رحمۃ اللہ علیہ پر تعریض کی ہے۔ البتہ یہ ضرور سچ ہے کہ ان کے نزدیک **امام صاحب** صرف امام المحدثین تھے۔ مسائلِ فقہیہ میں امام ممدوح کے استخراج یا تحقیقِ روایات میں ان کی رائے کو غیر مقلدین کی طرح **مولانا شبلی** نے کبھی وحیِ آسمانی یا نطقِ رسالت کا درجہ نہیں دیا۔

جہاں تک متن حدیث کا تعلق ہے، **مولانا** کو **امام بخاری** سے یک گونہ شیفتگی تھی اور بڑے اہتمام سے صحیح بخاری ' کا درس دیا کرتے تھے۔ خود دار العلوم ندوہ میں ایک عرصے تک یہ شغل جاری رہا۔ برادرِ مکرم **سید سلیمان ندوی** بھی اس حلقۂ درس کے شرکا میں تھے۔ یہاں ایک لطیفہ یاد آیا **سید سلیمان** صاحب درس کے بعد کچھ دنوں تک رفعِ یدین اور آمین بالجہر پر عامل رہے۔ چنانچہ **علامہ مرحوم** نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا دیکھتے ہو میں اتنا متشدد حنفی اور میرے وہ تلامذہ جنھوں نے مجھ سے بخاری ' پڑھی ہے **وہابی** ہوتے جارہے ہیں۔ **سید سلیمان** بھی رفعِ یدین کرنے لگے ہیں۔ میں نے عرض کیا آپ اس کے لیے متردد نہ ہوں، ابھی عمر کی طرح **سید صاحب** کے علم کا بھی شباب ہے۔ رفتہ رفتہ پختگی آئے گی تو وہ بھی **مولانا حمید الدین** کی طرح حنفیت کی طرف رجوع کرلیں گے۔

حنفیت میں اس قدر تشدد کے باوجود **مولانا** کی مذہبی رواداری اور فراخ دلی متشقف علما کو بہت کھٹکتی تھی۔ قادیانیوں اور شیعوں کی تکفیر میں **مولانا** نے کبھی دوسرے علما کا ساتھ نہیں دیا۔ چنانچہ ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ منعقدہ لکھنؤ کے موقع پر قادیانیوں کے ساتھ جوازِ نکاح کا سوال پیدا ہوا تو علما نے قادیانیوں کے کفر کا فتویٰ دیا، یہاں تک کہ محترمی مولانا **حبیب الرحمٰن خاں شروانی** مدظلہ جیسے اہلِ نظر بھی مکفرین کی جماعت میں شامل تھے۔ اس پر **مولانا** بہت کبیدہ خاطر ہوئے اور **شروانی صاحب** کی اس غیر متوقع تنگ نظری پر دوستانہ ملامت کا کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔

استاذ مرحوم کی اس وسیع المشربی میں صرف ایک استثنا تھا۔ سرکارِ رسالت (روحی فداہ) اور اہلِ بیتِ اطہار کی شان میں سوئے ادب کا شائبہ بھی ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ **ڈپٹی نذیر احمد** صاحب مرحوم کی **امہات الامہ** کا معاملہ جس نے **مولانا** کے بعض **الد الخِصَام** کو اپنی باطن کی سیاہی صفحۂ کاغذ پر پھیلانے کا موقع دیا، اسی جذبے کے ماتحت تھا۔

عقائد کی طرح اعمال میں بھی **مولانا** کی زندگی صحیح اسلامی اعتدال کا نمونہ تھی۔ لباس میں

انھوں نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی تفرج اختیار نہیں کیا۔لیکن بعض اربابِ عمائم کی طرح خواہ مخواہ کی چاک گریبانی اور نیم ساق کی عریانی کو اتباعِ سنت کا اشتہار بھی نہیں بنایا۔**علامہ مرحوم** کے چھوٹے بھائی **مہدی حسن** مرحوم انگریزی طرز پر چھری کانٹے سے کھانا زیادہ پسند کرتے تھے۔اس پر **مولانا** اس درجہ برہم ہوئے کہ مہینوں تک ان سے بولنا ترک کر رکھا تھا۔بعد کو خود ہی ایک روایت میں دیکھا کہ **حضور سرورِ عالم** نے چاقو سے کاٹ کر گوشت تناول فرمایا ہے تب جا کر برہمی کم ہوئی۔

پہلی رفیقۂ حیات کی وفات کے بعد مدتوں تک تجرد کی زندگی بسر کی اور اس پاکبازی کے ساتھ کہ صحت خطرے میں پڑ گئی۔کبھی کبھی بقائے صحت کی ضرورت تأمّل پر آمادہ کرتی۔تو بچوں کا خیال اور علمی مشاغل تذبذب پیدا کر دیتے۔یہی دماغی کش مکش تھی جس کا اظہار یوں کیا گیا ہے۔

مایۂ تقویِ سی سالہ فراہم شدہ است
ارمغانش بہ نگارے بدہم یا چہ کنم

آخر کار اطبا کے اصرار پر دوسری شادی کی۔مگر زوجۂ ثانیہ صرف چند سال زندہ رہ کر فوت ہوئیں۔پھر تا دمِ مرگ وہی تجرد کی زندگی قائم رہی۔

تعلیمِ نسواں کے مسئلے میں بھی **مولانا** کا طرزِ عمل بین بین تھا۔اپنے خاندان کی بچیوں کو اردو فارسی میں نوشت وخواند کی تعلیم دلائی تھی۔بعض متقشف فقہا کی طرح عورتوں کو کتابت سکھانا حرام نہ سمجھتے تھے۔مسلم خواتین کی بے حجابی ان کو پسند نہ تھی۔مگر ہمارے بعض علما کی طرح ہر بے پردہ خاتون کو نہ تو عصمت فروش سمجھتے تھے، نہ ان کے سینے میں ایسا بے قابو دل تھا جس کے پھسل جانے کا خوف ایسی خواتین سے ملنے جلنے میں مانع ہو۔**علامہ مرحوم** اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

یہ شعر حقیقت میں خود ان کی زندگی کا آئینہ تھا۔وہ اربابِ جبہ وعمائم جو اپنے تعیش اور نفس پرستی کے لیے مذہبی حیلے تلاش کیا کرتے ہیں، شاید اس راز کو نہ سمجھ سکیں۔مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ **مولانا** کی پوری زندگی جام وسنداں کی بازی گری اور کج دار ومریز کی مشق میں گزری، اور ہمیشہ اس میں کامیاب رہے۔بیشک **مولانا** کو فیضِ فطرت نے دلِ زندہ اور شیوۂ اہلِ نظر عطا کیا تھا مگر اسی کے ساتھ یہ

قدرت بھی دی تھی کہ قعرِ دریا میں رہ کے بھی اپنا دامن تر نہ ہونے دیں۔

مولانا کو **موسیقی** سے ذوق تھا اور ایک حد تک شناسائے فن بھی تھے، طرزِ انشا کی سادگی اور پُرکاری فنِ انشا میں بھی قائم تھی۔ شعر پڑھنے میں متانت اور ترنم کی اتنی لطیف آمیزش شاید ہی آج تک کسی کو میسر ہوئی ہو۔ بایں ہمہ محافل غنا تو الگ رہیں، مجالس وجد وسماع سے بھی انھوں نے ہمیشہ پرہیز کیا۔ عربی ڈراما دیکھنے کا شوق ایک مرتبہ **مولانا** کو قاهره تهیٹر هال تک کھینچ لے گیا، تو اس کو بھی سفر نامہ میں لکھ دیا چھپایا نہیں۔ بقول **سعدی**:

هیچ کس بے دامن تر نیست اما دیگراں
بازی می پوشند و مادر آفتاب افگنده ایم

مولانا فاضل متبحر، اور عالم متورع ہونے کے ساتھ ایک بذلہ سنج ادیب اور ایک رنگین نوا شاعر بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ شاعری وہ بھی فارسی کی شاعری، وہ حمام ہے جہاں بقول **علامہ مرحوم** "سعدی و حافظ بھی آکر ننگے هوجاتے هیں۔"

علامہ مرحوم کی بعض غزلوں کا رنگ یقیناً بہت شوخ ہے۔ جوان کی دستارِ فضیلت اور قبائے ورع سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ چنانچہ ایک بار اس خیال کا اظہار خود میں نے استاد مرحوم سے کیا تھا، تقریب یہ ہوئی کہ **علامہ مرحوم** نے اپنے مایہ ناز شاگرد اور پھوپھی زاد بھائی **مولانا حمید الدین فراہی** رحمۃ اللہ علیہ کی غزل کے جواب میں غزل لکھی۔ **مولانا فراہی** اور **علامہ مرحوم** کی غزلوں سے دو چار اشعار اس وقت ذہن میں محفوظ ہیں:

گردمے با ایں دل خستہ گزاری چہ شود
آرزوے دلِ بیمار برآری چہ شود
من خزاں دیدہ نہال استم و تو باد بہار
گر بہ خاکم رسی اے باد بہاری چہ شود

(**مولانا فراہی**)

شبِ وصل است حیا گر بگذاری چہ شود
یکدمم تنگ در آغوش فشاری چہ شود

تو بدیں حسن تو نگر چہ زیاں برداری
یک دو بوسہ اگر خود نہ شماری چہ شود
(علامہ نعمانی)

مولانا نے یہ غزل مجھ کو سنائی تو میں خاموشی سے سنتا رہا۔ جب **مقطع** کی نوبت آئی تو میں نے آہستہ سے عرض کیا کہ **مقطع** غلط ہے۔ **مولانا** نے میری اس غیر معمولی جسارت پر ذرا تند لہجے میں پوچھا: "فرمائیے کیا غلطی ہے؟" میں نے آہستگی سے عرض کیا: "تخلص صحیح نہیں ہے۔ **شبلی** کی جگہ حامد یا اقبال ہونا چاہیے تھے۔" ارشاد ہوا: "میاں یہ فارسی غزل ہے، درس ہدایہ نہیں ہے۔"

مگر یہ رنگین نوائی صرف شاعری کی دنیائے تخیل تک محدود تھی اور وہ بھی اس وقت بروئے کار آئی جب اپالو اور چوپاٹی کے جان بخش قدرتی مناظر دیدہ و دل کو پیامِ بے خودی دیتے۔ بعض کینہ پرور اشخاص محض اپنی پستیِ مذاق اور دونیِ فطرت کی بنا پر بمبئی کی غزل گوئی کا روڑا، اور خطوط شبلی، موسوعہ عطیہ کی اینٹ لے کر بھان متی کی طرح فریب کا ایک کنبہ جوڑنا اور اتہام کا ایک ہوائی قلعہ بنانا چاہتے ہیں، لیکن ان دشنام طرازوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ دروغ کا فروغ عارضی ہوتا ہے اور جھوٹ کی عمر چند روزہ۔ **زلیخا** کی بہتان تراشی دامنِ **یوسف** کی عصمت کو کب تک مشکوک رکھ سکے گی۔ انشاء اللہ کذب و افترا کا یہ دفتر بے معنی ایک دن غرقِ مے ناب ہو کر رہے گے۔ اور جب تک دلوں میں ایمان و دیانت کا ایک ذرہ اور دماغوں میں حق و انصاف کی ایک کرن باقی ہے، یہ خناسی وساوس معوذتین کی ایک تلاوت میں ہباءً منثوراً ہو کر رہیں گے۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ **علامہ مرحوم** کی غـــــــــزل گوئی محض ایک دماغی تفریح تھی اور خطوطِ شبلی موسوعہ عطیہ، کی حقیقت بزرگانہ ہمت افزائی سے زیادہ نہیں تھی۔ خانوادۂ **فیضی** سے **مولانا** کے روابط قدیم تھے۔ اسی دودمانِ علم و تہذیب کے ایک چشم و چراغ **حسن آفندی** تھے۔ جنھوں نے قسطنطنیہ کے (زمانہ قیام) میں **علامہ مرحوم** کے ساتھ نہایت مخلصانہ برتاؤ کیا تھا۔ اسی وقت سے دونوں خاندانوں میں عزیزانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ **زہرا**، اور **عطیہ مولانا** کو اپنا بزرگ سمجھتی تھیں اور **مولانا** کی چھوٹی صاحبزادی **فاطمہ مرحومہ** سے بہن کا رشتہ قائم کر کے خط کتابت کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔

مولانا عالم تھے مگر نکتہ سنج متقی تھے مگر وسیع المشرب۔ان کو معلوم تھا کہ 'ھر سخن موقع وھر نکتہ مکانے وارد' وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ ہوائے آزادی کی پروردہ اور یورپ کی اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین محملِ لیلیٰ میں قید نہیں کی جاسکتیں۔ نہ کسی مولوی کا وعظ ان کو طرزِ معاشرت بدلنے پر آمادہ کرسکتا ہے۔مگر بایں ہمہ بے پردگی **مولانا** ان خواتین کو عفت نسوانی سے محروم یا اسلام کے فیضِ روحانی سے یکسر بیگانہ نہیں سمجھتے تھے کہ ان کو مخاطب کرنا اپنے تقویٰ کی توہین سمجھیں۔ ہمارے موجود طرزِ تمدن نے طبقۂ نسواں کو جس طرح ناکارہ اور عضو مفلوج بنا رکھا ہے، اس کا بھی **مولانا** کو احساس تھا، تاریخِ اسلام میں مسلمان خواتین کے مجاہدانہ اور علمی کارنامے بھی ان کے پیشِ نظر تھے، انصاف مقتضی تھا کہ جدید طرزِ معاشرت میں جو محاسن ہیں ان سے اپنی آنکھیں بند نہ کریں۔ اس وقت مسلم خواتین میں اعلیٰ تعلیم کی مثالیں شاذ تھیں اس لیے **عطیہ** کی علمیہ کامیابی میں قومی مفاخرت کا بھی ایک پہلو تھا اس خاندان سے عزیزانہ روابط کی بنا پر **عطیہ** کی شہرت اور ترقی **مولانا** کے لیے ذاتی مسرت کا باعث تھی۔ **عطیہ** اور **زہرا** کو **مولانا** سے عقیدت تھی اور **مولانا** اس عقیدت کو ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ اس سے یہ کام لینا چاہتے تھے کہ ان تعلیم یافتہ خواتین کو اپنے اثر سے ملک اور قوم کی علمی اور عملی خدمت پر آمادہ کریں۔

اس کے لیے ضروری تھا کہ ملک کی قومی زبان (اردو) کے ادب وانشا سے دلچسپی پیدا کی جائے اور یہ اس وقت تک ناممکن تھا جب تک کچھ فارسی کا مذاق نہ ہو۔ظاہر ہے کہ مغرب کی زندہ زبانوں کے وسیع اور متنوع ادب کا ذوق آشنا آسانی سے اردو کا ابجد خواں نہیں بنایا جاسکتا۔اس کام کے لیے بڑے صبر، سلیقے اور نکتہ دانی کی ضرورت ہے۔ایسا طرزِ خطاب کس کام کا جس کو سننے اور قبول کرنے کے لیے مخاطب تیار نہ ہو۔ یہ ماحول تھا جس میں **مولانا** نے وہ خطوط لکھے ہیں۔ خدارا سوئے ظن کی تاریک فضا سے ہٹ کر اور عناد کی رنگین عینک آنکھوں سے ہٹا کر **شبلی** کا مطالعہ کیجیے، تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ نصیحت کی داروئے تلخ کو بزرگانہ محبت کے شہد میں قوام دیا ہے اور اس نوشِ داروکی ہر خوراک ادبِ لطیف کے ورقِ نقرہ میں لپیٹ کر پیش کی ہے۔اب اگر کسی صاحب کو ان خطوط کی بین السطور میں کچھ اور دکھائی دیتا ہے تو اس کے سوا، اور کیا کہا جائے کہ اس آئینے میں ان کو خود اپنی تصویر نظر آرہی ہے۔

تعجب ہے کہ **مولوی عبدالحق** صاحب جو غالباً زمانۂ قیام علی گڑھ میں **علامہ مرحوم** کے فیض یافتہ **مولانا** کے اعزہ اور تلامذہ مثلاً **مولانا حمیدالدین فراہی** مرحوم، **مولوی ظفر علی خان**، **مولوی سید محفوظ علی**

وغیرہ کے مخلص دوست اور انجمن ترقی اردو کی مسندِ نظامت پر علامہ کے جانشین بھی ہیں ان خطوط کو دوسرے زاویۂ نگاہ سے دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس سعی نامشکور سے ان کی اصلی مراد یعنی علامہ مرحوم کی رسائی تو پوری ہوتی نہیں اور ہو بھی ہو جائے تو لاحاصل ہے کیوں کہ خدانخواستہ **علامہ مرحوم** کوئی شیخ طریقت تو تھے نہیں کہ مریدین بدگمان ہو کر فسخ بیعت کر لیں گے اور صاحبِ سجادہ کی فتوحات میں کمی آ جائے گی۔ رہا **مولانا** کا علم و کمال وہ ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے، جس کو **مولوی** صاحب کیا ان جیسوں کی ایک فوج کوئی گزند نہیں پہنچا سکتی۔ البتہ دو محترم مسلمان بہنوں کے متعلق بے جا سوئے ظن کی اشاعت اور 'چشم بد اندیش' کے حق میں 'دعائے سعدی' کا اعادہ لازمی ہے۔

علامہ شبلی سے **مولوی عبدالحق** صاحب کی مخالفت اور اس مخالفت کا ابتدائی سبب بنائے **فاسد علی الفاسد** کی ایک بہترین مثال ہے، خدا جانے ہمارے **مولوی** صاحب نے یہ کس طرح فرض کر لیا ہے کہ اسلامی ہند کے دو مایۂ ناز ادیب **حالی و شبلی** ایک دوسرے سے عناد رکھتے تھے، **مولانا حالی** پر تو اس طرح کی بدگمانی کرنے کا موقع بھی نہ تھا اور **علامہ شبلی** کی نسبت بھی مجھے بہ وثوق معلوم ہے کہ وہ اپنے معاصرین میں **مولانا حالی** کا سب سے زیادہ احترام کرتے تھے اور **مولانا** کی شرافتِ اخلاق، دقتِ نظر، صحتِ ذوق اور ادبی نکتہ سنجی کے بے حد معترف تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ **علامہ مرحوم** کو 'حیاتِ جاوید' کے بعض حصوں سے اختلاف تھا مگر یہ اختلاف بھی **مولانا حالی** کی مخالفت پر مبنی نہ تھا بلکہ ان کی انتہائی عزت کی بنا پر تھا۔ اگر **مولانا حالی** کے سوا کوئی دوسرا غیر ذمہ دار شخص وہی لکھتا جو **مولانا حالی** نے 'حیاتِ جاوید' میں لکھا ہے تو شاید **علامہ شبلی** اس کو قابلِ خطاب بھی نہ سمجھتے۔ لیکن **مولانا حالی** جیسے راست باز اور بلند فطرت سے اس مدلل مداحی اور تاریخی قصیدہ خوانی کی توقع نہیں ہو سکتی تھی جس کے نمونے 'حیاتِ جاوید' میں اکثر ملتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ **علامہ شبلی** کو 'حیاتِ جاوید' کی تصنیف پر کوئی رشک تھا۔ کیوں کہ **سرسید** کی انتہائی کوشش ابتدا سے یہی رہی کہ ان کی تاریخِ زندگی **علامہ شبلی** کے قلم سے نکلے۔ لیکن **علامہ مرحوم** نے ہمیشہ اس سے پہلو بچایا۔ چنانچہ **سرسید** اور **علامہ مرحوم** میں اندرونی اختلاف کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ آخر کار جب **سرسید** کو **علامہ شبلی** کی طرف سے قطعی مایوسی ہو چکی تب **مولانا حالی** کا انتخاب اس خدمت کے لیے عمل میں لایا۔

ہاں اگر **مولوی عبدالحق** صاحب **علامہ شبلی** سے اس لیے برہم ہیں کہ **علامہ مرحوم سرسید** کے مذہبی عقائد اور سیاسی طرزِ عمل یا دوسرے لفظوں میں شریعتِ علی گڑھ کی صراطِ مستقیم سے منحرف تھے اور نہ صرف خود منحرف ہوئے بلکہ ایک بڑی جماعت کو اپنے زورِ قلم سے انحراف پر آمادہ کر دیا تو ہم کو **مولوی** صاحب سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ کیوں کہ **علامہ شبلی** کا یہ جرم ہم کو بھی تسلیم ہے، اربابِ علی گڑھ کی طرف سے **مولانا** نے خود فردِ قرارداد جرم ان اشعار میں مرتب کر دی ہے:

عالم میں ہیں ہر اک کے فرائض جدا جدا
یہ مسئلہ مسلمۂ خاص و عام ہے
ہے مقتدی کا فرض فقط امتثالِ امر
ارشاد و حکم منصبِ خاصِ امام ہے
تھا قوم کا جو فرض، وہ تھا عطائے زر
آگے مقدسینِ علی گڑھ کا کام ہے
یہ بارگاہ خاص نہیں مجلسِ عوام
سمعاً و طاعۃً یہ ادب کا مقام ہے
مخصوص ہیں مناصب خاصانِ بارگاہ
تم کون ہو جو تم کو یہ سودائے خام ہے

پھر اشعارِ ذیل میں اپنے جرم کا اعتراف بھی کر لیا ہے:

وہ دن گئے کہ بت کدہ کو کہتے تھے حرم
وہ دن گئے کہ خاک کو دعوائے نور تھا
وہ دن گئے کہ شانِ غلامی کے ساتھ بھی
ہر بوالہوس خمارِ سیاست میں چور تھا
وہ دن گئے کہ شارعِ اول کا حرف حرف
ہم پایۂ کلامِ سخن گوے طور تھا
وہ دن گئے کہ فتنۂ آخر زماں کے بعد

گویا کہ اب امامِ زماں کا ظہور تھا
اب معترف ہیں دیدہ ورانِ قدیم بھی
اس نقشِ سیمیا میں نظر کا قصور تھا
یہ لمعۂ سراب نہ تھا چشمۂ بقا
یہ تیرگی تھی جس کو سمجھتے تھے نور تھا
اب یہ کھلا کہ واقفِ سر تھا اسی قدر
جو جس قدر مقامِ تقرب سے دور تھا
سب مٹ گیا سیاست سی سالہ کا طلسم
اک ٹھیس سی لگی تھی کہ یہ شیشہ چور تھا

علامہ شبلی کے مذہبی رجحانات میں تو درجہ بدرجہ تبدیلیاں بھی ہوئیں، لیکن سیاسیات میں ان کی رائے ابتدا سے وہی تھی، جس پر وہ آخر تک قائم رہے، مسلمانوں کا مخصوص جماعتی مفاد اور ان کی قومی و سیاسی ترقی کا خیال ان کو کسی لیڈر سے کم نہ تھا، مگر یہی خیال ان کو کانگریس کی مخالفت سے روکتا تھا، وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان غلام ہو کر ایک مسلم کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتا، لہٰذا خود اسلامی مفاد کے لیے اصل مرض یعنی غلامی کا دفعیہ شرطِ اولین ہے اور استخلاصِ وطن اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک ہندوستان کی دونوں بڑی قومیں کم سے کم اس مقصد کے لیے ایک مرکز پر جمع نہ ہو جائیں۔ اکثریت سے نہ وہ خائف تھے، نہ مسلمانوں کو اکثریت سے ڈرا کر بزدل بنانا چاہتے تھے۔ ان کی یہ رائے صحیح تھی یا غلط، اس کا فیصلہ تو مستقبل کرے گا۔ لیکن بہرحال یہ امر خود معاندینِ **شبلی** کو تسلیم ہے، چنانچہ داستان تاریخِ اردو، کے مصنف نے ص: ۶۷۳ پر **خواجہ سید غلام الثقلین** صاحب کی حسبِ رائے نقل کی ہے:

وہ آزادخیالی مذہب ھی کے دائرے میں محدود نہ رکھتے تھے، بلکہ اس کو پالیٹیکس تك پھنچاتے تھے۔ چنانچہ آخری عمر میں انھوں نے اپنے پولیٹیکل خیالات کو پوشیدہ نھیں رکھا۔ سرسید احمد خاں مرحوم مذھب میں کچھ کم

آزاد خیال نه تھے۔ لیکن سیاسی معاملات میں وہ
زیادہ تر قدامت پسند یا کنز رویٹو واقع ہوئے
تھے، اس لیے کالج کی پروفیسری کے زمانے ھی
میں مولانا شبلی کو سرسید کے سیاسی خیالات
سے سخت کراھت تھی۔

والفضل ما شھدت بہ الاعداء

تعجب ہے کہ اس کے باوجود فاضل مؤلف نے ص: ۶۸۵ پر یہ عبارت کیوں کر لکھی ہے:

۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگالہ کی منسوخی اور اس کے
بعد جنگِ بلقان کا ھیجان پیدا ھوا تو علامہ
شبلی نے پولیٹیکل کروٹ بدلی۔

علامہ نے کبھی خود کوئی پولیٹیکل کروٹ نہیں بدلی، البتہ جب تقسیمِ بنگالہ کے بعد بعض بیدار دل مسلمانوں کو سرسید کی قائم کردہ 'جی حضوری' پالیسی کی غلطی کا کچھ احساس ہو چلا تو علامہ مرحوم نے یہ محسوس کیا کہ اب جماعتِ اسلامی صدائے حق سننے پر آمادہ معلوم ہوتی ہے، لہٰذا حقیقت کے پردے سے نقاب اٹھا دینا چاہیے اور اسی بنا پر ایک نہایت مدلل مضمون 'مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ' کے عنوان سے مسلم گزٹ ' کی کئی اشاعتوں میں شائع کیا۔ ہمیں افسوس ہے کہ فاضل مؤلف نے نہ تو اس مضمون کا تذکرہ کیا ہے، نہ اس کا کوئی اقتباس دیا ہے۔ حالانکہ علامہ مرحوم کا یہ مضمون کمالِ انشا پردازی اور قوتِ استدلال کی حیثیت سے ایک زندہ جاوید شاہ کار ہے۔

عبدالرحیم خانخاناں کا کتب خانہ

علاء الدین خاں

ہندوستان میں **مغل** حکومت کے قیام کے ساتھ ہی علمی وتمدنی سرگرمیاں بڑھیں، چنانچہ قدیم مدارس کی توسیع وترقی کے ساتھ ساتھ بہت سے نئے مدارس وجود میں آئے۔ ہندوستان کے تعلقات وروابط عرب وایران ودیگر ممالک سے استوار ہوئے، اس طرح بیرونی علما کی ہندوستان آمد اور علمائے ہند کے بیرونی سفر میں مزید آسانیاں فراہم ہوئیں اور ایک دوسرے سے استفادہ اور کتابوں کے تبادلے کے بہتر مواقع میسر ہوئے۔ **مغل** عہد میں ایران سے تعلقات کی مضبوطی کے ساتھ علمائے معقولات کی آمد ورفت میں اضافہ ہوا، اور علومِ عقلیہ کی کتابیں بہ کثرت یہاں مہیا ہوئیں۔

بابر جب ہندوستان آیا تو اپنے ساتھ بیش بہا کتابیں بھی لایا، اس کی محبوب کتابیں گلستانِ سعدی، شاھنامہ فردوسی، مثنوی نظامی، مثنوی خسرو، ظفر نامہ یزدی اور طبقاتِ ناصری تھیں، ان سب کتابوں کا تزکِ بابری میں ذکر ملتا ہے۔ **بابر** کو جب

کسی مہم کے دوران کوئی کتب خانہ ملتا تو اپنے بیٹے **ہمایوں** کے سپرد کر دیتا۔ ۱۵۲۵ء میں پنجاب کے افغان **امیر غازی خاں** کا کتب خانہ **بابر** کو دستیاب ہوا، اس نے اس کتب خانے سے کچھ منتخب کتابیں **ہمایوں** اور **کامران** کے پاس بھیج دیں، **ہمایوں** جب جنگی مہمات کے لیے نکلتا تو اس کے ساتھ منتخب کتابیں ہوتی تھیں۔ مرأۃ سکندری، کا مؤلف لکھتا ہے:

میرے والد جو همایوں کے کتب خانے کے مهتمم تهے
همه وقت بادشاه کے حضور میں کتابیں پیش
کرنے میں مامور رهتے تهے، تزکِ جهانگیری ' میں
همایوں کے کتب خانے کے مهتمم کا جو باز بهادر
کے لقب سے مشهور تها ذکر ملتا هے۔[۱]

دھلی کے پرانے قلعے میں **ہمایوں** کا کتب خانہ تھا، اس میں **ہیئت، ریاضی** اور **نجوم** پر نادر کتابیں تھیں۔ **اکبر** کے علمی ذوق کے سبب جو کتب خانہ قائم ہوا وہ بڑا قیمتی تھا، قلعہ آگرہ میں مثمن برج کے قریب کا کمرہ کتب خانے کے لیے مخصوص تھا۔ **ہمایوں** کے کتب خانہ کی جتنی کتابیں تھیں وہ **اکبر** کے کتب خانے میں موجود تھیں۔ **اکبر** کے کتب خانے میں چوبیس ہزار کتابیں تھیں۔ ۱۵۶۵ء میں **فیضی** کے انتقال کے بعد اس کی تمام کتابیں شاہی کتب خانے میں منتقل کر دی گئیں، ان کی کل تعداد ۴۶۰۰۰ تھی۔[۲] اس طرح **اکبر** کے کتب خانے کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ **مغل** عہد میں اہلِ ذوق اور صاحبِ ثروت کے یہاں کاتب اور صحافی تنخواہ دار ملازم ہوا کرتے تھے جن کا کام کتابیں تیار کرنا تھا۔ ایک روز شہزادہ **سلیم**، **ابوالفضل** کے گھر گیا تو چالیس کاتبوں کو **کلام پاک** اور **تفسیر** نقل کرتے ہوئے دیکھا، ظاہر ہے کہ شاہی کتب خانے کے لیے اور بھی زیادہ کاتب اور خوشنویش مقرر رہوں گے۔[۳] آئینِ اکبری، میں ہے کہ **اکبر** نے کتب خانے کو کئی شاخوں میں تقسیم کر رکھا تھا، ایک شاخ قصرِ شاہی کے اندر تھی اور ایک باہر، یہ دونوں شاخیں مختلف شعبوں میں تقسیم تھیں، کتابیں اور رسائل اپنی قیمت اور اہمیت کے اعتبار سے مختلف مدارج میں شامل کیے جاتے تھے، **ہندی، فارسی، یونانی، کشمیری** اور **عربی** زبان کی کتابیں نظم و نثر کے اختلاف کے لحاظ سے علاحدہ علاحدہ رکھی جاتی تھیں اور **اکبر** کے حضور میں پیش ہوتی رہتی تھیں۔[۴] **جہانگیر** کو کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا، اس کے کتب خانے میں تزکِ بابری، کا وہ نسخہ بھی

موجود تھا جو خود **بابر** کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ **جہانگیر** کو کتابوں سے جو والہانہ محبت تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے **مارٹن** لکھتا ہے:

وہ اچھی کتاب ہر قیمت پر خریدنا چاہتا تھا۔
ایک بار بادشاہ نے ایک کتاب کو تین ہزار طلائی
مہروں یعنی دس ہزار پونڈ میں خریدا۔[۵]

مغل عہد میں چار طرح کے کتب خانوں کا ذکر ملتا ہے:

(۱) **شاہی کتب خانہ**

(۲) **مدرسوں کے ملحقہ کتب خانے**

(۳) **تکیوں، خانقاہوں اور مسجدوں کے کتب خانے**

(۴) **امراء کے کتب خانے**

مآثر الامراء، میں اکثر منصب داروں اور امیروں کے حالات کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ان کے محلوں میں کتب خانے موجود تھے اور وہ روزانہ کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ **امیر محمد خاں نیازی** جو عہدِ اکبری کا ایک امیر تھا، اشراق کی نماز سے فارغ ہو کر تفسیر و سیر کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا[۶] اسی طرح دیپال پور کا فوج دار **مبارز خاں** فرصت کے لمحات تفسیر و فقہ کے مطالعے میں گزارتا تھا۔[۷]

مغل عہد کے تذکروں اور تاریخی کتب کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر **مغل** منصب دار وسیع کتب خانوں کے مالک تھے، ان میں **ابوالفضل**، **فیضی**، **عبدالرحیم خانخاناں**، **منعم خاں**، **ظفر خاں**، **مرزا امان اللہ خاں امانی** کے کتب خانے بہت ہی مشہور تھے۔ ان میں **عبدالرحیم خانخاناں** کا کتب خانہ نمایاں حیثیت کا حامل تھا۔

عبدالرحیم خانخاناں، **بیرم خاں** کا فرزند تھا ۱۵۵۶ء میں لاہور میں پیدا ہوا، ابھی یہ چار سال کا ہی تھا کہ **بیرم** کا قتل ہو گیا، اس لیے **عبدالرحیم** کی شاہی نگہداشت میں پرورش و پرداخت ہوئی، **اکبر** نے اس کی تعلیم و تربیت کا نہایت اعلیٰ پیمانے پر انتظام کیا، اس کے اساتذہ میں **ملا محمد امین اندیجانی**[۸] اور **غازی خاں بدخشی** کے نام ملتے ہیں۔ **عبدالرحیم** کو عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبان کے علاوہ تفسیر، حدیث، فقہ، ریاضی، تاریخ، ہیئت اور فلسفہ وغیرہ تمام مروجہ علوم کی تعلیم دی گئی، وہ

جنگی اور فوجی علوم وفنون میں بھی ماہر تھا، جب وہ بالغ ہوا تو **اکبر** نے اسے **مرزا خاں** کا خطاب عطا کیا۔ وہ **عربی، فارسی، ترکی** اور **ھندی** میں **رحیم** (تخلص)[9] کے نام سے اشعار بھی لکھا کرتا تھا، نثر نویسی میں مہارت کا یہ عالم تھا:

در جمیع نوشته جات مهمام سلطنت وسپه سالاری از کلی وجزوی بد بیری ومنشی محتاج نیستند، وخود بنفس نفیس متوجه تحریر آنهامی گردیدند، بقول نهاوندی الحال در هندوستان مکاتبات وفرامین را بهتر از یشاں کسی ننوشته ونمی تواند نوشت۔[10]

عبدالرحیم ممتاز عالم، سخن وراور سخن پرور تھا، وہ **ادب** اور **فنونِ لطیفہ** کا مربی وسرپرست تھا، مآثرِ رحیمی، میں ایسے شعراوادبا کی ایک لمبی فہرست دی گئی ہے جو اس کے خوانِ کرم پر پرورش پاتے تھے، عہدِ **اکبر** و **جہانگیر** میں وہ بلند وذمہ دار عہدوں پر فائز رہا، اکیسویں سالِ جلوس ۱۵۷۷ء میں **اکبر** نے اسے گجرات کا حاکم مقرر کیا۔ اٹھائیسویں سالِ جلوس میں اسے **شہزادہ سلیم** کا اتالیق بنایا گیا اور اسی سال اسے **خانخاناں** کا خطاب اور پنج ہزاری منصب عطا ہوا۔[11] ۹۱-۱۵۹۰ء میں اسے ملتان کا حاکم مقرر کر کے ٹھٹّہ اور سندھ کی تسخیر کا حکم دیا گیا، یہاں اسے فتح نصیب ہوئی۔ **شکیبی** نے بطور تہنیت ایک **مثنوی** لکھی جس کے صلہ میں **خانخاناں** نے اسے ایک ہزار اشرفی دی۔[12] ۹۶-۱۵۹۵ء میں **خانخاناں** کو دکن روانہ کیا گیا، عہدِ **اکبر** و **جہانگیر** میں اس کا بہت سا وقت وہیں گزرا، اقامتِ دکن کے زمانے میں اس کا مستقر برھان پور تھا، **جہانگیر** کے عہد میں ۱۶۲۶ء میں ۷۲ سال کی عمر میں راہی ملکِ عدم ہوا۔[13]

عبدالرحیم کو کتابوں سے حد درجہ شغف اور لگاؤ تھا۔ یہ لگاؤ اور محبت اسے اپنے باپ **بیرم خاں** سے وراثت میں ملی تھی۔ اس کے والد **بیرم خاں** کے پاس ایک کتب خانہ تھا، اس کتب خانے کی ایک کتاب نوھار لائبریری (کلکتہ) میں موجود ہے۔[14] یہ کتاب **علامہ محی لاری** کی فتوح الحرمین، کا ایک نادر نسخہ ہے۔ **عبدالرحیم خانخاناں** ملکی اور حکومتی فرائض کی بجا آوری کے

سلسلے میں مختلف مقامات پر مقیم رہا۔ وہ احمد آباد ، گجرات، ملتان اور برھان پور میں بحیثیت صوبہ دار مقیم رہا۔ ظاہر ہے کہ اس دوران اس کا کتب خانہ بھی انہی علاقوں میں رہا ہوگا۔ ۱۶۱۳ء میں اس کا کتب خانہ آگرہ میں تھا کیوں کہ اس سال **نظیری** نے اپنا دیوان اسی جگہ سپردِ کتب خانہ کیا تھا۔[۱۵]

مغل عہد پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ اس عہد میں کتب خانے کے لیے علاحدہ عمارت ہوا کرتی تھی، البتہ جو کمتر درجہ کے امرا ہوا کرتے تھے، ان کی حویلیوں میں علاحدہ کمرے میں کتابیں رکھنے کا اہتمام ہوا کرتا تھا اور یہ کمرے ہر طرح کے نوشت وخواند کے سامان سے مزین رہا کرتے تھے، **عبدالرحیم خانخاناں** کے حالاتِ زندگی پر **عبدالباقی نہاوندی** نے ایک کتاب "مآثرِ رحیمی" کے نام سے لکھی ہے جس میں **خانخاناں** کی علمی وادبی سرگرمیوں کے ساتھ اس کے کتب خانے کا بھی ذکر کیا ہے، جہاں اس زمانے کے تمام اساتذہ کے دواوین اور مشاہیر کی تصانیف موجود تھیں اس کتب خانے میں اہلِ علم، مشاہیر شعرا واد با اور دواوین جمع کرنا فخر سمجھتے تھے، "مآثرِ رحیمی" سے **عبدالرحیم خانخاناں** کے کتب خانے سے متعلق بیش بہا معلومات فراہم ہوتی ہیں، لیکن اس کتب خانے میں کتابوں کی تعداد کتنی تھی، اس کا علم نہ تو "مآثرِ رحیمی" سے ہوتا ہے اور نہ ہی دیگر ہم عصر مآخذ سے۔

یہ حقیقت ہے کہ **خانخاناں** علمی ذوق رکھتا تھا، اسے مطالعہ کتب کا بے حد شوق تھا، وہ سرکاری فرائض کی بجا آوری کے باوجود مطالعے کے لیے وقت نکال لیتا تھا، "مآثرِ رحیمی" کا مصنف لکھتا ہے:

در خلوت وانجمن بتلاوت کلام ملك علام
ومطالعۂ کتب علمی مشغول دارند۔[۱۶]

مصنف نے "مآثرِ رحیمی" میں **خانخاناں** کی کتابوں سے دلچسپی و دل بستگی کے بعض دلچسپ حالات بھی لکھے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ سیر وشکار کے لیے جاتے ہوئے بھی "همیشه در بالائی اسپ جز و دردست ایشاں بوده مطالعه می کرده اند"[۱۷] اسی طرح اس کے ذوقِ مطالعہ سے متعلق "مآثرِ رحیمی" میں درج ہے:

ذوق مطالعه ایشاں بمرتبۂ بوده که در وقت بآب
در آمدن وغسل نمودن جزء را بدست یکے از

ملازمان می داده که درکنار آب می ایستاده
وخود دردرون آب مطالعه نموده اند۔ [۱۸]

مذکورہ عبارت سے پتا چلتا ہے کہ کھانا کھانے، غسل کرنے، کپڑا بدلنے اور اسی نوعیت کے دوسرے کاموں کے دوران میں بھی کتاب کے مطالب جاننے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا تھا۔

عبدالرحیم خانخاناں کا کتب خانہ ایک علمی مرکز تھا، علما وفضلا دور دراز کے علاقوں سے آ کر یہاں مقیم ہوتے تھے اور کتب خانے سے اپنی علمی تشنگی بجھاتے تھے۔ یہاں علمی مجالس اور مذاکرے منعقد ہوا کرتے تھے، علمی مباحث کے علاوہ مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے۔ [۱۹] اکثر لوگ اسی کتب خانے کی بدولت مختلف علوم میں ماہر ہو گئے۔ **نہاوندی** کے مطابق:

دانشمندان در کتاب خانه اش که مکتب خانه
هوشمند انست بافاده واستفاده شهره عصر
شدند۔ [۲۰]

نہاوندی ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:

بسیاری ازیں دانشمنداں که در خاتمۂ ذکر شده
(مآثرِ رحیمی) از فاتحه تا خاتمه در کتاب خانه
عالیش درس فضل وافضال خوانده اند وکتب
آداب نموده شهره شهر ومعروف عصر گردانیده
اند۔ [۲۱]

مصنف ایک اور جگہ رقم طراز ہے:

گم گشتگان بوادی تربیت واخلاص بمعمورۂ
دانش مندی رسیده اند والحال ازیمن تر بیتش
چراغ افروز محفل دانش وبینش اند چوں
نشوند که ازیں کتاب خانه جواهر معنی اندوخته

اندودرین مجلس راہ سخنوری یافتہ اند۔[۲۲]

مولانا صوفی کے بارے میں **نہاوندی** نے لکھا ہے:

در سلك ودیگر مستعدان وطالب علمان كه در كتاب خانۂ عالی می بوده اند، منسلك گشته بود۔[۲۳]

اسی طرح **مولانا محبِّ علی** نے جن کا شمار جید عالم میں ہوتا تھا، اسی جگہ تربیت حاصل کی۔[۲۴] اور زر و جواہر کے علاوہ **خانخاناں** اپنے کتب خانے سے استفادہ کرنے والوں کو کتابیں بھی عطا کیا کرتا تھا۔

عبدالرحیم خانخاناں کے کتب خانے سے ملا ہوا، ایک دار الترجمہ بھی تھا اس کے مہتمم **ملا محمد علی کشمیری** تھے۔[۲۵] یہاں مختلف موضوع و زبان سے متعلق کتابوں کے فارسی تراجم ہوا کرتے تھے۔ اس کتب خانے میں کس طرح کی کتابیں تھیں اس کا ذکر تو نہیں ملتا لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے تمام شعرا و ادبا کے تحریر کردہ دیوان و کلام و نثری کتب یہاں موجود تھیں، اسی طرح **اکبر و جہانگیر** کے عہد کی تصنیف و تالیف کی کئی کتابیں یا تراجم اس لائبریری میں موجود تھے، تمام قدیم کتب کے نسخے بھی یہاں موجود تھے۔ غالب گمان یہ ہے کہ اس بے نظیر کتب خانے میں **شاعری، تاریخ، انشا، صرف و نحو، نجوم و فلسفہ، تفسیر، حدیث، فقہ تصوف** اور **اخلاق** وغیرہ کی کتابیں موجود رہی ہوں گی۔

خانخاناں کے کتب خانے کا ناظر **میر باقی** تھا۔[۲۶] ناظر کے بعد داروغہ کتب خانہ یا مہتمم کتب خانہ کا درجہ تھا، یہ ناظم کی ہدایت پر کتب خانے کے اندرونی معاملات کو دیکھتا تھا، نئی کتابوں کی کتابت اور خرید اسی کے ذمہ ہوتی تھی۔ **خانخاناں** کے کتب خانے کا مہتمم یا داروغہ، **شیخ برہمی** تھا، اس کے بعد اس کا لڑکا **شیخ عبدالسلام** اس عہدے پر فائز ہوا۔ داروغہ کی زیرِ نگرانی کتابوں کی دیکھ ریکھ کرنے والا ایک عملہ بھی ہوا کرتا تھا، اس میں **کاتب، مقابلہ ساز، خوشنویس، جلد ساز، نقاش، جدول ساز** اور **مصور** وغیرہ شامل تھے۔ اسی طرح مآثرِ رحیمی، کے مصنف نے کتب خانے میں کام کرنے والے بہت سے فن کاروں کا ذکر کیا ہے۔ تصویر سازی کا کام **میاں ندیم** اور **میاں فہیم** کے سپرد تھا۔[۲۷] **نقاشوں** میں

مولانا مشفق اور بہبود تھے، بہبود خطِ نسخ و تعلیق میں بھی دسترس رکھتا تھا۔ **مولانا ابراہیم** نقاش بھی **خانخاناں** کے ملازموں میں تھا۔[۲۸] **کاتبوں** میں **ملا عبدالرحیم عنبریں قلم ہروی** سب سے ممتاز تھا۔[۲۹] **ملا محمد مومن** خطِ نسخ، تعلیق اور جلی نویسی میں ماہر تھا، یہ جلد سازی میں بھی ماہر تھا، ۳۵ برس تک **خانخاناں** کے کتب خانے میں رہا۔ اس کا بھائی **محمد حسین** بھی کتب خانے سے متعلق تھا، یہ صحاف اور جلد ساز تھا، **مولانا درویش** خطِ تعلیق میں ماہر تھا، **خانخاناں** اسے انعامات سے نوازتا تھا۔ بڑھاپے میں کاشان چلا گیا اور اپنی جگہ اپنے لڑکے **محمد قاسم** کو چھوڑ گیا۔[۳۰] **ملا امین** خراسان کے رہنے والے تھے، طلا کاری میں استاد تھے، **خانخاناں** کے یہاں چار ہزار روپے ان کی تنخواہ تھی۔ اسی طرح کتب خانے کے عملے میں **ملا محمد حسین خراسانی** تھے، یہ فنِ تذہیب، جدول سازی و عکس میں بے نظیر تھے، انھوں نے اکثر کتابوں کی تزئین کی، کاغذ ابری ایجاد کیا، عکس ہفت رنگ کا اختراع کیا، **خانخاناں** اسے بہت پسند کرتے تھے۔[۳۱] اس کتب خانے میں جو ماہرینِ فنون تھے، ان سے لوگ تربیت لیا کرتے تھے، اس طرح کتب خانے سے مختلف علوم وفنون کی ترویج واشاعت بھی ہوا کرتی تھی۔

عبدالرحیم خانخاناں کا کتب خانہ ایک عجوبہ روزگار ادارہ تھا، یہ کتب خانہ ایک عدیم النظیر علمی مرکز تھا، ہر شخص اس کی کتابوں سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ **خانخاناں** نے اپنا بے مثل کتب خانہ احمد آباد، گجرات میں قائم کیا تھا، اس میں نادرالوجود قلمی کتابوں کا ایک ذخیرہ تھا، نایاب جلدیں تھیں، **اکبر** کے عہد کے ہر قابل شخص کی زندگی پر لکھی ہوئی کتابیں تھیں، اس کے کتب خانے میں ۹۵ فضلا وعلما مستقل طور سے موجود رہتے تھے، اس کے علاوہ بہت سے علما عارضی طور سے کتب بینی اور استفادہ کے لیے آیا کرتے تھے۔ کتب خانے کی یہ خصوصیت تھی کہ اس میں ہم عصر ادبا، شعرا، اور اساتذہ کے دواوین اور مشاہیرِ علما کی تصانیف موجود تھی، اہلِ دانش وبینش اپنی کتابیں اور دیوان اس کتب خانے میں جمع کر کے فخر محسوس کرتے، اس کتب خانے میں ماہرین کا ایک عملہ بھی تھا جو نسخوں کی کتابت کرتا، تصویریں بناتا، مرقع تیار کرتا، کتابوں کی لوح پر طلا کاری کا کام انجام دیتا تھا، خود **خانخاناں** نے اپنے طور پر تعلیم کی اشاعت میں بڑا کام کیا، مآثرِ رحیمی کے مطابق علما ان کے فیض سے مستفیض ہوتے تھے اور درس حاصل کرتے تھے، ان کے کتب خانے میں ہر شخص مطالعہ کرنے اور اپنی علمی استعداد بڑھانے کے لیے جا سکتا تھا۔

حواشی

۱۔ 'شاہان مغلیہ کے کتب خانے اور ان کا نظام' —— **حاجی محمد زبیر** یہ مقالہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ میں ۱۷/مارچ ۱۹۵۱ء میں پڑھا گیا۔

۲۔ بزمِ تیموریہ (جلد اول) **سید صباح الدین عبدالرحمٰن**، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی ۱۹۹۵ء، ص:۵۹۸

۳۔ ایضاً، ص:۵۹۹-۵۹۸

۴۔ ایضاً، ص:۵۹۹

۵۔ 'عہدِ جہانگیری میں کتب خانے' —— **تنویر جہاں خاں**، رسالہ المعارف (پاکستان) جون ۱۹۸۴ء

۶۔ مآثر الامراء (جلد سوم) **صمصام الدولہ، شاہنواز خاں**، ص:۷۶-۳۷۵

۷۔ ایضاً، ص:۴۴۴

۸۔ مآثر رحیمی (جلد دوم) **عبدالباقی نہاوندی**، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال طبع ۱۰۲۵، **عبدالباقی نہاوند**، ہمدان میں پیدا ہوئے، **خانخاناں** کی ملازمت میں آئے اور انہی کی فرمائش پر مآثرِ رحیمی لکھی، جو ۱۶۱۶ء میں مکمل ہوئی، یہ تین جلدوں پر مشتمل ہے جس میں تین ہزار دو سو اکیانوے صفحات ہیں۔ **خانخاناں** کے آباواجداد، غزنی، سلاطینِ بنگالہ، سلاطین شرقی، مالوہ، مانڈو، کشمیر، ملتان، سندھ و گجرات، سلاطینِ دھلی اور باہر سے **جہانگیر** کے عہد تک کے حالات اس میں درج ہیں۔

۹۔ ایضاً، ص:۵۶۱

۱۰۔ ایضاً، ص:۵۵۰

۱۱۔ ایضاً، ص:۱۱۷

۱۲۔ مآثر الامراء (جلد دوم) ص:۲۹۷

۱۳۔ مآثر الامراء (جلد اول) ص:۷۰۸-۷۰۷

۱۴۔ Catalogue of Buhar Library Vol. 1, p.260

۱۵۔ مآثر رحیمی (جلد سوم) ص:۱۱۸

۱۶۔ مآثر رحیمی (جلد دوم) ص:۵۳۹

۱۷۔ ایضاً،ص:۵۴۰

۱۸۔ ایضاً،ص:۵۴۰

۱۹۔ ایضاً(جلدسوم)ص:۵۶

۲۰۔ ایضاً،ص:۸

۲۱۔ ایضاً(جلددوم)ص:۵۸۸

۲۲۔ ایضاً،ص:۵۸۹

۲۳۔ ایضاً(جلدسوم)ص:۵۷

۲۴۔ ایضاً(جلددوم)ص:۵۸۸

۲۵ ایضاً(جلدسوم)ص:۵۹-۵۸

۲۶۔ ایضاً(جلدسوم)ص:۱۶۸،**میرباقی** ماوراء النہر کا سید تھا،صوبہ داریِ گجرات کے زمانے میں **خانخاناں** کے حضور باریاب ہوا،اور کچھ عرصہ کتب خانے میں کام کرتا رہا۔

۲۷۔ یہ دونوں بھائی نومسلم **راجپوت** تھے اور انھوں نے **خانخاناں** کے زیرِ سایہ تعلیم وتربیت حاصل کی تھی۔

۲۸۔ مآثرِ رحیمی (جلدسوم)ص:۱۶۸۸

۲۹۔ ایضاً،ص:۱۶۷۸

۳۰۔ ایضاً،ص:۱۶۸۳

۳۱۔ ایضاً،ص:۷۹-۱۶۷۸

یادِ ماضی کے نقش

حیدرآباد دکن کی انجمن آرائی

[۴]

اختر حسین رائے پوری

زیادہ نہیں، کچھ کم دو سال مجھے **مولوی عبدالحق** کے ساتھ حیدرآباد اور اورنگ آباد میں کام کرنے کا اتفاق ہوا مگر **طالسطائی** کو نوجوان **گورکی** نے جس غور سے دیکھا تھا کچھ اسی انداز سے میں نے اس بزرگ شخصیت کو دیکھا۔ جنھوں نے **مولوی صاحب** کے دیدار پاکستان میں کیے وہ ان کے کئی اوصاف سے ناآشنا ہے کیوں کہ یہ ان کے زوال کا وقت تھا بلکہ میری دانست میں دھلی کے دورانِ قیام میں بھی ان میں وہ بات نہ رہی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں جب **گاندھی جی** نے اردو کو للکارا تو **مولوی صاحب** کی زندگی کا رُخ بدل گیا۔ اس سے پہلے وہ کچھ اور تھے۔ میں نے انھیں اس موڑ پر گزرتے ہوئے قریب سے دیکھا تھا۔

۱۹۱۱ء میں جب **مولوی صاحب** کو محکمۂ تعلیم کی ملازمت اورنگ آباد لے آئی تو وہ یہیں کے ہو رہے۔ یہاں فطرت اور تاریخ کا وہ سنجوگ ہے جو انھیں پسند تھا۔ اورنگ آباد کا نام **اورنگ**

زیب عالمگیر سے منسوب ہے جس نے اپنے طویل عہدِ حکومت کا آدھا حصہ دکن کی مسلم مملکتوں کے انضمام اور مرہٹوں کی روک تھام میں اس طرح صَرف کیا کہ سلطنت کی بنیاد ہل گئی۔ نہ وہ بھرے دربار میں **شیواجی** کی توہین کرتا اور دکن کی باج گزار شیعہ ریاستوں کا قلع قمع کرتا اور نہ یہ مصیبت آتی۔ بہرصورت اس زمانے کی یاد دلانے کے لیے شکستہ ایوانوں کے آثار یہاں سے اورنگ آباد تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ وہی دولت آباد ہے جسے صدیوں قبل **محمد تغلق** نے دھلی چھوڑ کر کچھ وقت کے لیے اپنا پایۂ تخت بنایا تھا۔ واپس جاتے وقت وہ جن لوگوں کو چھوڑ گیا اُنھی نے دکنی اردو کی تخم ریزی کی اور ان کے جو نام لیوا رہ گئے تھے ان کی صورت شکل اور لہجے کے کرارے پن میں مرحوم دھلی کی ایک چھاپ لگی ہوئی تھی۔ پاس ہی ایلورا کے وہ غاریں ہیں جن کی رگوں سے ہزار سال قبل نامعلوم ساحر فن کاروں نے حسن و جمال کی اسی مورتیں ایجاد کی تھیں جن کا تصور بھی کوئی مجسمہ ساز نہیں کرسکتا۔ وہیں دیوگری کا ناقابلِ تسخیر قلعہ چٹانوں کی کوکھ سے نکل کر اس دن کو یاد کرتا تھا جب **ملک کافور** کی گرفت سے فرار ہوتے وقت **دیول دیوی**، **امیر خسرو** کی مثنوی کے لیے اپنی تصویر چھوڑ گئی تھی۔

اورنگ آباد کے مضافات میں اورنگ زیب کی چہیتی ملکہ **رابعہ زمانی** کا مقبرہ ہے جو دکن کا تاج کہلاتا ہے کیوں کہ تاج محل کے نمونے پر تعمیر ہوا ہے۔ مقبرے کے داروغہ کے بنگلے کو **مولوی صاحب** نے اپنی سکونت کے لیے منتخب کیا تھا اور حیدرآباد کے تبادلے کے بعد بھی ہر سال کچھ وقت وہ یہیں گزارتے تھے بالخصوص برسات میں۔ اول جنگِ عظیم سے دو سال قبل علی گڑھ سے انجمن ترقی اردو ایک ٹوٹے ہوئے صندوق میں چند اوراقِ پریشاں کے ساتھ **مولوی صاحب** کے پاس اورنگ آباد پہنچی تھی۔ پھر انھوں نے اس نونہال کی پرورش خونِ جگر پلا کر جس طرح کی اس کا ذکر اردو زبان کی تاریخ کا روشن باب ہے۔ انجمن کا دفتر، اشاعت گھر اور چھاپے خانے کے ساتھ یہیں رہا تاوقتیکہ ۱۹۳۸ء میں دھلی منتقل ہوگیا۔ سچ تو یہ ہے کہ **مولوی صاحب** کو اردو سے ماں کی سی عقیدت اور انجمن سے بیٹی کی سی شفقت تھی۔ ان سے ہٹ کر انسانی تعلقات ان کے لیے بے معنی تھے۔ حسن انھیں صرف فطرت میں نظر آتا تھا اور برِصغیر کے قدرتی مناظر ان کی نگاہ میں سمائے ہوئے تھے۔ موسم کا لطف اٹھانا وہ خوب جانتے تھے اور گو کم خور تھے لیکن خوش خور تھے۔ حقے کا تمباکو اجیّن سے تو چائے دارجلنگ سے آئے اور سگریٹ ہو تو **عبداللہ مارکہ**۔ ان کے ساتھ رہ کر

میری عادتیں بھی بگڑیں۔ جب **مولوی صاحب** اپنے فلسفۂ حیات کی تشریح کے لیے یہ کہاوت سناتے تو میں جوش سے ٹیپ کا بندؤ ہراتا:

جو کوئی ہم سے سیدھم سادھا سیدھم سادھا
ہم بھی اس سے سیدھم سادھا سیدھم سادھا
اور جو کوئی ہم سے ٹیڑھم ٹیڑھم ٹیڑھم ٹاڑھا
ہم بھی اس سے ٹیڑھم ٹیڑھم ٹیڑھم ٹاڑھا

دوسرے بند کے ساتھ وہ تن آور درخت کی طرح اکڑ گئے اور بادِمخالف کی طرف یوں چھڑی تان گویا کہ کسی نادیدہ دشمن پر وار کر بیٹھیں گے لیکن پہلے بند کے ساتھ ان کا جسم تسلیم و تعظیم کے انداز میں جھک گیا۔

کج کلاہی اور تسلیم میں توازن آسان نہیں اور آخری عمر میں توازن کا میزان ہی ٹوٹ جاتا ہے افسوس کہ پاکستان میں جن لوگوں نے **مولوی صاحب** کی کلاہ اُتاری وہ انہی کے پروردہ تھے۔ ایسے ہی موقعے کے لیے **رسول کریمؐ** نے فرمایا تھا:

جن پر تم نے احسان کیا ھے اُن سے ھوشیار رھو۔

مقبرے کے بنگلے کے ایک کمرے میں بیٹھ کر میں دن بھر **لغت نویسی** میں مصروف ہو گیا اور لفظ و معنی کی تلاش میں ایسا محو ہو گیا جیسے کوئی کیمیا گر جڑی بوٹیوں سے رسایِن بنانے کی جستجو کرتا ہو۔ صبح سویرے **مولوی صاحب** کے ساتھ پہاڑیوں کی سیر کو نکل جاتا اور شام کو تنہا آثارِ کہنہ میں پھرتا رہتا تھا جہاں میرا بے لگام تخیل صدیوں پرانی ارواح یا دفینوں کو تلاش کرتا تھا۔

اورنگ آباد یا حیدر آباد میں **مولوی صاحب** کی رہایش گاہ کی وہی شان تھی جو علی گڑھ میں **رشید احمد صدیقی** کے مکان کی۔ باہر سے آنے والے عالموں اور دانش وروں کی گہما گہمی رہتی تھی۔ البتہ شعرائے کرام ان کی مہمان نوازی سے محروم رہتے تھے۔ عہدِ حاضر کے اردو شعرا میں **مولوی صاحب**، **اقبال** کے علاوہ کسی کے قائل نہ تھے۔ حیدر آباد میں **فانی** کو کبھی کبھی ان کے دیوان خانے میں غزل پڑھتے سنا۔ مگر جب وہ چلے گئے تو منہ بنا کر کہا:

دردِ غم اور چیز ھے، اشك شوئی اور چیز ھے۔

خیر۔ذکر اورنگ آباد کا تھا جہاں بنگلے میں ڈاکٹر **لطیف**، ڈاکٹر **عابد حسین**، **قاضی عبدالغفار** وغیرہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ **مولوی صاحب** اونچا سنتے تھے لہٰذا زور سے بولتے تھے۔ایک دن میں نے انھیں کہتے سنا:

ایسا بے نیاز آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ یا تو کسی
طرح نہ آتا تھا اور جو آیا تو نہ سفرِ خرچ کا ذکر
کیا نہ تنخواہ کو پوچھا۔

دراصل میرے کردار میں ایسا استغنا ہے کہ مشفق ہو یا معشوق، مطلب کی بات نہیں کی جاتی۔ نہ دستِ طلب کبھی دراز ہوا، اور نہ لب پر حرفِ مدعا آیا۔ جو جس نے خوشی سے دیا لے لیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ حق تلفی بھی ہوئی اور زیاں کاری بھی لیکن دماغ و دل آسودہ رہے اور یہ بھی ایک قسم کی نعمت ہے۔

ہماری سرزمین کا سب سے دلکش موسم برسات ہے اور اس کا صحیح لطف شمال نہیں دکن میں آتا ہے۔یوں تو اورنگ آباد میں گرمی برائے نام پڑتی تھی تاہم دھوپ میں پیڑ پودے کمھلا جاتے تھے اور ندی نالے خشک ہو جاتے تھے لیکن جون کے دوسرے پکھواڑے (عشرے) کے ساتھ گھٹا امنڈ کر آئی اور ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ جل تھل ایک ہو گئے۔ صبح جو آنکھ کھلی تو بنگلے کے پڑوس میں برساتی ندی زور شور سے بہہ رہی تھی۔ ہوا خنک ہو گئی تھی پہاڑیوں میں آبشار جاری ہو گئے تھے، برگ و شجر پر زردی کی جگہ ہریالی نے لے لی تھی اور **مولوی صاحب** پکار پکار کر کہہ رہے تھے:

چھوڑو کتابوں کو قدرت کا نظارہ کرو کہ یہی
علم کا سرچشمہ ہے۔

ان کے ملازم کسی خوش نما مقام پر پکوان بنانے لگے اور ہم سب **مولوی صاحب** کے ازن پر سیر کے لیے نکل گئے۔

جولائی ۱۹۳۵ء کے آخر میں حیدر آباد کا رختِ سفر بندھ رہا تھا کہ ایک دن ڈاک میں **مولوی صاحب** کے نام ان کے پرانے دوست **ظفر عمر صاحب** کا خط علی گڑھ سے آیا۔ وہ پولیس کے اعلیٰ افسر تھے نیز نیلی چھتری ، بھرام کی گرفتاری ،وغیرہ جاسوسی ناولوں کے مشہور مصنف تھے۔ علی گڑھ سے چلتے وقت میں ان کی صاحبزادی **حمیدہ** کا خواست گار ہوا تھا۔اس

جسارت پر وہ کبیدہ خاطر ہوئے لیکن فیصلہ **مولوی صاحب** پر چھوڑ دیا۔ چناں چہ **مولوی صاحب** نے مجھے وہ خط دکھلایا اور پوچھا:

کیا تم اس لڑکی کو جانتے ہو اور اس سے شادی
کرنا چاہتے ہو؟

جب میں نے اقرار کیا تو ذرا دیر خاموش رہ کر سوال کیا:

شادی کی ذمے داری کو تم نہیں سمجھ سکتے۔
ابھی تمھارا تجربہ کیا اور عمر کیا ہے؟

میں نے عرض کیا:

وقت کے ساتھ یہ ذمے داری اٹھانے کا تجربہ
ہوجائے گا۔ اگر آپ کو میری ثابت قدمی پر
بھروسا ہے تو سفارش کردیجیے۔

اس طرح کچھ عرصے بعد میری شادی ہوگئی اور جب تک **حمیدہ** حیدر آباد میں رہیں۔ **مولوی صاحب** نے ان سے بیٹی کا سا سلوک کیا اور گھر کا انتظام ان کے سپرد کر دیا۔

حمیدہ میری رفیقۂ حیات ہیں اور گو میں تا عمر پتنگ کی طرح دُور دُور اُڑتا رہا لیکن انھوں نے ڈور چھوڑی نہ کنّی کٹنے دی۔

حیدر آباد میں **مولوی صاحب** ایک کشادہ کوٹھی میں رہتے تھے جس کا نام **نادر منزل** تھا۔ اس کے ایک حصے میں **پنڈت کیفی** اور ڈاکٹر **عابد حسین** کام کے سلسلے میں مقیم تھے۔ ایک کمرے میں مولوی **احتشام الدین** اردو لغت کی تدوین میں مصروف رہتے تھے۔ کتب خانے کے وسیع ہال میں ہزاروں کتابوں اور مسودوں کے درمیان **مولوی صاحب** یوں بیٹھے رہتے تھے جیسے مراقبے میں ہوں۔ بس حقے کے غوغے اور دکنی کے اشعار کی تلاوت سے ان کی موجودگی کا ثبوت ملتا تھا۔

رسالہ اردو (جولائی ۱۹۳۵ء) میں جب میرا مقالہ 'ادب اور زندگی' شائع ہوا تو اس کا بڑا شہرہ ہوا، اور **مولوی صاحب** کی فرمایش کے مطابق میں ہر شمارے کے لیے کوئی مضمون لکھتا۔ نیز ادبِ عالم کے اہم واقعات کو مرتب کرنا اور 'ناخدا' کے نام سے کتابوں پر تنقید کرتا تھا۔ یہ سلسلہ دو سال

تک جاری رہا۔ گو میری تحریروں کا مزاج رسالے کی روایت سے ہٹ کر تھا اور **مولوی صاحب** کا ذوق خالصتاً کلاسیکی تھا لیکن انھوں نے میرے قلم پر کوئی پابندی نہیں لگائی اور کسی اعتراض کی پروا نہیں کی۔ یہ مضامین بعد میں میرے دونوں تنقیدی مجموعوں 'ادب اور انقلاب' اور 'روشن مینار' میں شامل ہوئے۔ فرصت کے وقت جو افسانے لکھے گئے وہ 'محبت اور نفرت' میں یک جا ہو گئے۔

ساتھ ہی ساتھ میں **انگریزی، ہندی لغت** کے ابتدائی مراحل سے گزرتا رہا لیکن ایک دلچسپ حادثے نے اس کام میں رخنہ ڈال دیا۔

رسالہ 'الناظر' (لکھنؤ) کے مدیر **ظفر الملک علوی** ہر سال حیدر آباد کا پھیرا لگاتے تھے۔ اور رئیسوں کو کشف و کرامات کے علاوہ یوگ کی ورزشوں کا بھی درس دیتے تھے۔ **مولوی صاحب** کو انھوں نے وہ ورزش سکھلائی جس میں آدمی سر کے بل کھڑا ہو جاتا ہے تاکہ خون دماغ کی طرف جائے اور اسے **شیرشی آسن** کہتے ہیں۔ **مولوی صاحب** کی عمر اس وقت ۶۵ سال تھی تاہم جسم میں کس بل کی کمی نہ تھی لیکن جب وہ سر کے بل کھڑے ہوئے تو شانہ اتر گیا اور ہم لوگوں نے انھیں اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ درد میں اُف کرنا تو انھیں آتا نہ تھا۔ ایک بار بچھو نے انگلی میں ڈنک مار دیا اور وہ درد کو ضبط کیے چپ بیٹھے رہے۔ اس بار بھی انھوں نے تکلیف کا ذکر نہ کیا۔ ہاں لیٹے لیٹے **ظفر الملک** کو بُرا بھلا کہتے رہے۔ ابھی ان کی مالش اور دوا دارو جاری تھی کہ انھیں **انگریزی اردو لغت** کے فائنل پروف کے پُلندے کا خیال آیا۔ آخری پروف وہ خود دیکھتے تھے۔ اورنگ آباد کا پریس باقاعدگی سے اس کام میں لگا ہوا تھا اور انھیں وسوسہ تھا کہ معلوم نہیں کتنی تاخیر ہو جائے۔ مجھ سے کہا:

تم غور سے یہ پروف دیکھ ڈالو اور پھر ایک ایک
ورق کی تنقیح مجھ سے کرواکر انھیں اورنگ آباد
بھیج دو۔

مجھے اس قسم کا کام دقّتِ نظر سے کرنے کا شعور تھا۔ چناں چہ پروف کی تنقیح کرتے وقت میں نے چند ایسی غلطیوں کی نشان دہی بھی کی جو پچھلے پروف میں رہ گئی تھیں۔ اس کام سے **مولوی صاحب** بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے فی الحال **ہندی لغت** اٹھا کر رکھو۔ وہ کام بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس **لغت** کے 'ایس' (S) سے لے کر آخر تک فائنل پروف میں نے پڑھے۔ **لغت** کا **ضمیمہ** اور اس کا

مختصر ایڈیشن بھی تیار کیا۔

انگریزی ھندی لغت کا وہ ابتدائی مسودہ، پہلے ایڈیشن کی پہلی کاپی اور لغت کے متعلق **مولوی صاحب** کے خطوط اب تک میرے پاس محفوظ ہیں۔

اگر شمال کے ماحول میں ولولے اور ہنگامہ خیزی کا احساس ہوتا تھا تو دکن میں سکون اور جماجمی کا گمان ہوتا تھا۔ یہی حال دنیا کے دوسرے شمالی اور جنوبی خطوں کا ہے۔ خواہ امریکہ ہو یا یورپ۔ مدراس اگر ہندو علوم کا مرکز تھا تو حیدآباد ہند اسلامی تہذیب کا گہوارہ۔ ساتویں صدی کے بعد جب شمال میں ہندو سماج کا دامن چاک ہونے لگا تو اس کی بخیہ گری دکن میں ہوئی اور اس کا روپ اب تک باقی تھا۔ ھندو سنگیت اور نرت کا انمول رس دکن میں ملتا تھا اور ویدانت یا سنسکرت کے ایسے **پنڈت** کہیں نہیں تھے۔ دکن میں اسلامی علوم کے متعلق ایسے دعوے نہیں کیے جاسکتے تھے تاہم جامعہ عثمانیہ کے دار الترجمہ دائرۃ المعارف اور انجمن ترقی اردو نے ایک ایسے باب کا اضافہ کیا تھا جس کی مثال شمال میں نہیں تھی۔ اس وقت صحیح معنوں میں حیدرآباد اور لاھور اردو کے دو بڑے مرکز تھے۔ اٹھارہویں صدی میں جب شمال کے مسلمانوں کے ہاتھ سے تلوار اور انیسویں صدی میں سپر تک گر گئی تو ایک میسور اور دوسری حیدرآباد کے حصے میں آئی۔ ماضی ہو یا حال کسی دور کی تہذیب نہ سراسر بے عیب ہوتی ہے نہ سراسر عیب دار۔ یہی حال حیدرآباد کی تہذیبی روایت کا تھا جس کا ڈانڈا دھلی اور لکھنؤ سے ملتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ جاگیرداری سے اس کا چولی دامن کا ساتھ تھا اور اس میں انحطاط کے آثار نمایاں تھے لیکن جب حیدرآباد پر ھندوستان نے فوج کشی کی تو یہ کسی بہتر معاشی نظام کا غلبہ نہیں بلکہ ہندو قومیت کی یلغار تھی جس کی خوں چکاں داستاں **پنڈت سندرلال** کی انکوائری رپورٹ میں درج ہے۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جاگیرداری نظام میں اگر آدمی ہل سے بندھا ہوتا ہے تو صنعتی سماج میں مشین کے ساتھ۔ آج کا آدمی مشین کا غلام ہے اور خوش ہے کہ کولہو کا بیل نہیں رہا۔

مسز سروجنی نائیڈو کا خانوادہ

حیدرآباد میں **سروجنی نائیڈو** کے دولت کدے کی وہی آن بان تھی جو کبھی پیرس کی نامی

گرامی علم وفن کی سرپرست خواتین کے **سالون** کی ہوا کرتی تھی۔

انگریزی میں اس پائے کے شعر کہتی تھیں اور ایسی خوش تقریر تھیں کہ سب انھیں **بلبلِ ھند** کہتے تھے۔ گو وہ کانگریس کی صفِ اول کی لیڈر تھیں لیکن اپنی رواداری کی وجہ سے مسلمانوں میں بھی بہت مقبول تھیں۔ ان کے خانوادے میں جیسے ذہین وفطین لوگ تھے شاید ہی کسی اور گھر میں بیک وقت ان کی مثال نظر آئے۔ **سروجنی** کے والد اپنے زمانے کے مشہور سائنس داں تھے اور ان کے شوہر نامور سرجن تھے۔ ایک بھائی **چٹوپادھیائے** یورپ میں تعلیم ختم کر کے انقلاب کے بعد روس چلے گئے اور **ایم این رائے** کی طرح کمیونسٹ انٹرنیشنل (*Communist International*) سے وابستہ ہو گئے۔ پھر جب **اسٹالن** نے پرانے انقلابیوں کا قتلِ عام کیا تو یہ بھی مارے گئے۔ اگر **ایم این رائے** ھندوستان بھاگ نہ آتے تو ان کا بھی وہی حشر ہوتا۔

مسز نائیڈو کے چھوٹے بھائی **ہرین چٹرجی** بے مثل اداکار اور شاعر اور موسیقی داں ہیں لیکن ان سے زیادہ بے قرار آدمی دیکھنے میں نہ آیا۔ **مسز نائیڈو** کی بڑی لڑکی **مس پدم جامدتوں** مغربی بنگال کی گورنر رہیں اور چھوٹی **لیلامنی** وزارتِ خارجہ کے اعلیٰ عہدے پر فائز رہیں۔ غرض کی ہمہ خانہ آفتاب و ماہتاب تھا۔ ان سب سے میری ملاقات تھی لیکن دوستی **مسز نائیڈو** کے بڑے لڑکے ڈاکٹر **جے سوریہ** سے تھی جنھیں سب **'بابا'** کہا کرتے تھے۔

جرمنی میں دس سال رہ کر اور ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگری لے کر **بابا** ابھی ابھی آئے تھے اور آتے آتے **'ایوا'** کو بیاہ لائے۔ یہ دونوں **نازی دشمن تحریک** میں عملی حصہ لے چکے تھے لہٰذا **ہٹلر** کے برسرِ اقتدار آتے ہی ھندوستان نکل آئے۔ مجھ سے اور **حمیدہ** سے اُن کے جو تعلقات استوار ہوئے جیتے جی باقی رہے۔ **بابا**، غیر مقلد قسم کے اشتراکی تھے۔ ایسی جدّتِ طبع میں نے شاید ہی کسی اور میں دیکھی ہو۔

ان کی صحبت میں میری روح کے کئی گوشے روشن ہوئے۔ اب تک میرے کان **موسیقی** کے رس سے ناواقف تھے۔ **بابا** اور **ایوا** نے مجھے مغربی **موسیقی** کے رمز سمجھائے اور یورپ کے قیام کے وقت مجھے اس سے لذت آشنا ہونے کے بہت سے موقعے ملے۔ ہندوستانی **موسیقی** کا شوق بعد میں امرت سر میں ہوا۔ میرے ان دوستوں کو حیوانوں سے محبت تھی اور ان کے چھوٹے فلیٹ میں چرند

و پرندامن وآشتی سے رہتے تھے۔ یہ شوق بھی مجھے اسی زمانے میں ہوا، اور اس کا پہلا تجربہ **نادر منزل** میں جس طرح ہوا، اس کا حال میں نے 'مولوی عبدالحق کا چڑیا گھر' کے عنوان سے ایک مضمون بھی لکھا ہے۔ (مطبوعہ: اوراق، لاہور ۱۹۶۹ء) **حمیدہ** اور میرے لیے حیدرآباد میں **نادر منزل** کے بعد یہ فلیٹ ہمارا دوسرا گھر تھا۔

بات ۱۹۳۶ء کے آغاز تک پہنچی جب یورپ میں بحران اور ملک میں ہیجان برپا ہو چکا تھا۔ **فاشزم** نے ایسا زور باندھا کہ **مسولینی** کی افواج نے بڑی دیدہ دلیری سے حبشہ پر قبضہ کرلیا اور دنیا کہرام مچاتی رہ گئی۔ اس واقعے کا **مولوی صاحب** پر گہرا، اثر ہوا، اور انھوں نے مجھے ایک کتاب مرتب کرنے کی ہدایت کی۔ یہ کتاب انجمن نے 'حبشہ و اطالیہ' کے نام سے شائع کی اور اس میں **قاضی عبدالغفار**، ڈاکٹر **حمیداللہ**، ڈاکٹر **یوسف حسین** وغیرہ کے مضامین شامل تھے۔

اس کے فوراً بعد **ہٹلر** اور **مسولینی** کی تائید سے **جنرل فرانکو** نے اسپین کی جمہوری حکومت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور تین سال تک وہ خانہ جنگی برپا ہوئی جس نے دورِ جدید کی شعوری زندگی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ **فاشزم** کی دانستہ حوصلہ افزائی مغربی ملکوں کے سرمایہ دارانہ مفاد نے کی لیکن **اسٹالن** کو **فاشزم** کے خطرے کا شدید احساس تھا اور اس کی ہدایت پر دنیا بھر کے کمیونسٹ فاشسٹ دشمن عناصر سے مل کر متحدہ محاذ بنانے میں مصروف تھے۔ یہ تحریک سیاست کے علاوہ علم وفن اور ادب وغیرہ کی سمتوں میں بھی گامزن تھی اور اس میں اشتراکی (سوشلسٹ) لبرل وغیرہ سبھی شامل تھے۔ ۱۹۳۶ء میں **سجاد ظہیر** وغیرہ نے اسی پس منظر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ڈالی تھی۔

ملکی سیاست بھی ایک نئے موڑ پر آ گئی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان میں آئینی اصلاحات کا قانون پاس کر دیا تھا جس کی رُو سے صوبائی خودمختاری کا اصول تسلیم کرلیا گیا تھا اور اس کے مطابق صوبائی انتخابات کی تیاری شروع ہو رہی تھی۔ یہ قانون تقسیمِ ملک تک بلکہ آزادی کے بعد بھی ہندوستان اور پاکستان میں نافذ رہا تا آنکہ انھوں نے اپنے اپنے آئین مرتب نہیں کر لیے۔

اس وقت کانگریس بڑی منظّم جماعت تھی اور اسے مسلمانوں کے قوم پرست گروہ اور

کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی تائید حاصل تھی جس کی وجہ سے اس کی رجعت پسند قیادت پر پردہ پڑ گیا تھا۔ مسلم اکثریت کو اس قیادت پر کوئی اعتبار نہ تھا اور مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کا کام **جناح صاحب** نے ابھی شروع کیا تھا۔ یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ ہندو قومیت اور مسلم قومیت الگ الگ سمتوں میں رواں ہیں اور متحدہ قومیت کی تحریک تھوڑے سے نیک نیت لوگوں تک محدود ہے۔ سیاست کا بایاں بازو کمزور تھا اور اُسے برطانوی سامراج سے زیادہ یورپ کے فاشزم کا فکر لاحق تھا۔ پھر **جواہر لال نہرو** کا جادو اس کے سر پر ایسا چڑھا کہ **اندرا گاندھی** کے دور تک نہیں اترا۔

یہ صورتِ حال تھی کہ اپریل کا مہینہ آ گیا جب **مولوی صاحب** شمال کے سالانہ دورے پر نکلتے تھے۔ اُسی وقت **گاندھی جی** کا دعوت نامہ موصول ہوا جس میں تحریر تھا کہ قومی جدوجہد میں ادیبوں کی کارگزاری پر غور و خوض کے لیے انھوں نے ناگپور میں مہینے کے آخر میں ایک جلسہ منعقد کیا ہے۔ ملک کے ایک سو منتخب دانش وروں اور ادیبوں کو مدعو کیا گیا تھا جن میں **مولوی صاحب** کے علاوہ بھی شامل تھے۔ اس وقت ہم نے دعوت نامے پر کوئی توجہ نہیں دی اور ریل پر بیٹھ کر دھلی روانہ ہو گئے۔

حیدر آباد کی شمالی سرحد پر قاضی پیٹھ نامی جنکشن تھا جہاں ریل پٹری بدل کر دھلی کی جانب رواں ہو جاتی تھی لیکن پلیٹ فارم پر چہل قدمی کے لیے اترا تھا کہ شام کے جھٹ پٹے میں **جگر صاحب** نظر آئے جو وحشت کے عالم میں اِدھر اُدھر گردش کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کی باچھیں کھل گئیں اور بولے: "میاں کسی طرح مشکل کشائی کرو۔ پیاس سے گلے میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔" میں اُن کی بے کلی کی وجہ سمجھ گیا اور پوچھا: "تردد کیا ہے۔ بیرے سے کہیے ڈبّے میں پہنچا دے گا اور یہ منظور نہیں تو اسٹیشن کے بار میں بیٹھ کر پی لیجیے۔" لیکن **جگر صاحب** کو یہ دونوں باتیں پسند نہ تھیں۔ انٹر کے ڈبّے میں ہم سفر اُنھیں پینے کی اجازت کیسے دیتے اور بار میں بیٹھنے میں خدشہ تھا کہ کہیں گاڑی نہ چھوٹ جائے۔ جب میں نے **مولوی صاحب** کو یہ ماجرا سنایا تو انھوں نے بلا تکلف کہا: "جگر کو یہیں بلا لاؤ اور بیرے سے کہو کہ اُن کے لیے نوش دارو لائے۔" یہ سن کر مجھے سخت حیرت ہوئی لیکن **مولوی صاحب** کسی قسم کے احتساب کو پسند نہ کرتے تھے۔ چناں چہ جب **جگر** شرماتے ہوئے ہمارے سیکنڈ کلاس کے ڈبّے میں داخل ہوئے اور بصد معذرت **مولوی صاحب** کے سامنے مؤدّب جام پر جام لنڈھانے لگے تو بڑی دل لگی

رہی۔ پھر جب رنگ چڑھا تو وہ لہک لہک کر اپنا کلام سناتے رہے اور اس کی داد **مولوی صاحب** 'ہوں'، 'ہاں' یا منہ چڑھا کر دیتے رہے۔ خاصی دیر بعد جب ٹرین کہیں ٹھہری تو **جگر** ہنسی خوشی ہم لوگوں سے رخصت ہو کر اپنے ٹھکانے چلتے بنے۔

جب ہم دھلی پہنچے تو پلیٹ فارم پر **مجاز** انتظار کر رہے تھے۔ میں نے انھیں پہلے سے اطلاع دے دی تھی۔ **مولوی صاحب** اپنے آبائی وطن ہاپوڑ برادرِ بزرگ **ضیاء الحق** صاحب سے ملنے دو دن کے لیے جا رہے تھے اور میرا رُخ علی گڑھ کی طرف تھا۔ فرمایا:

تم بھی ہاپوڑ چلے چلو۔ وہاں سے علی گڑھ چلے
جانا اور میں لاہور ہوتا ہوا فلاں تاریخ کو
دھلی میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں ملوں
گا۔ اُسی رات کو حیدرآباد روانگی ہے۔

یہ پروگرام بنا کر ہم ریستوراں میں بیٹھ گئے کیوں کہ گاڑی چلنے میں ڈیڑھ گھنٹے کی دیر تھی۔ اس اثنا میں وہ **مجاز** سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتے رہے۔ اس حد تک کہ اُس غریب کو **'چونچ'** کہہ کر پکارنے لگے اور بعد میں جب کبھی **مجاز** کا ذکر آیا، اُسے پیار سے **'چونچ'** ہی کہتے تھے۔

مولوی عبدالحق کے بڑے بھائی ضیاء الحق

شیخ ضیاء الحق مولوی صاحب سے عمر میں کئی سال بڑے تھے۔ دراز قد، سینہ چوڑا چکلا، دہانہ پھیلا ہوا، رنگ گہرا سانولا، چھوٹی چھوٹی دھنسی ہوئی چمک دار آنکھیں، آواز میں گھن گرج غرض ایسے کل ٹھلے کے آدمی تھے کہ پہلی نظر میں ڈر لگتا تھا۔ وہ 'پمفلٹ باز' کے لقب سے مشہور تھے کیوں کہ اظہارِ مدّعا کتاب یا مضمون میں نہیں پمفلٹ میں کرتے تھے۔ اُن کی ذات سے جو روایت منسوب تھی اس کا ذکر ذرا تفصیل سے کیا جائے گا۔

اس صدی کے آغاز میں ہندوستان میں برطانوی سامراج میں ایسا استحکام نظر آتا تھا کہ چند وکیلوں اور دانش وروں کے علاوہ کوئی اس پر حرف زنی کی جسارت نہیں کرتا تھا۔ لیکن بعض قوم پرست نوجوانوں نے دہشت پسندی کا راستہ اختیار کیا اور اس غرض سے جو خفیہ تنظیمیں بنائیں ان میں سے دو

نے آزادی کی جنگ میں خاص کردار ادا کیا۔ ایک تو بنگال کی یگانتر پارٹی اور دوسری جلاوطن حریت پسندوں کی غدر پارٹی جس کی نشوونما کینڈا اور امریکہ میں ہوئی۔ **مولوی برکت اللہ بھوپالی** اس کے سرگرم رکن تھے اور ان کی سوانح عمری میں اس کا مفصل حال ملے گا۔

یگانتر پارٹی کا اولین مقصد یہ تھا کہ بنگال کی تقسیم کو کالعدم کیا جائے جو ۱۹۰۵ء میں عمل میں آئی تھی۔ اس سلسلے میں انگریزوں کے خلاف دہشت گردی کے کئی واقعات سرزد ہوئے جن میں سے سب سے سنگین وہ حادثہ تھا جو علی پور بم کیس سے موسوم ہے۔ بھری عدالت میں انگریز سیشن جج کو ہلاک کرنے کے الزام میں **خودی رام بوس** نامی نوجوان کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی اور اس نے اپنی صفائی میں ایسا ولولہ انگیز بیان دیا تھا کہ ملک کی مردہ رگوں میں تازہ خون دوڑ پڑا۔ اسی موقعے پر **اکبر الہ آبادی** نے کہا تھا:

پروانہ کا حال اس محفل میں ہے قابلِ رشک اے اہلِ نظر
اک رات ہی میں پیدا بھی ہوا عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

ٹیگور نے اس واقعے کی یاد میں جو نظم لکھی وہ اس طرح شروع ہوتی ہے:

جودی تو مار ڈاک شے، کیو آشے نا تو بے ایکلا چولورے
ایکلا چولو، ایکلا چولو، ایکلا چولورے
اگر تری پکار سن کر کوئی نہیں آتا تو نہ سہی،
تو اکیلا چلا چل، اکیلا چلا چل

اس نظم کی تال پر معلوم نہیں کتنے آتشِ نفس، آزادی اور انقلاب کی راہ پر چل پڑے تھے۔

جب بنگال کے دونوں حصے ازسرِ نو متحد کر دیے گئے تو یگانتر پارٹی کا زور ٹوٹ گیا اور اس کے کچھ ارکان شمالی ہند میں پھیل گئے۔ ان میں **رام بہاری بوس** کا نام قابلِ ذکر ہے۔ کیوں کہ ۱۹۱۵ء میں دہلی میں **وائس رائے لارڈ ہارڈنگ** پر سرِ بازار بم پھینکا گیا تو شبہ اُنہی کے گروہ پر ہوا۔ ان میں سے کئی پکڑے گئے اور کئی بھاگ گئے۔ **رام بہاری بوس** جاپان چلے گئے اور تاعمر برطانوی سامراج سے نبرد آزما رہے۔ مفروروں میں **ضیاء الحق**، **سردار اجیت سنگھ** (شہیدِ دکن **بھگت سنگھ** کے چچا) اور صوفی **امبا پرشاد** بھی تھے۔ ان میں سے **ضیاء الحق** بعد میں ہندوستان لوٹ آئے، باقی دونوں باہر رہ

گئے ۔**اجیت سنگھ** نے بـرازیـل میں سکونت اختیار کر لی اور گزشتہ جنگِ عظیم میں اطالوی ریڈیو پر آزاد هـنـد حکومت کی خدمت انجام دی۔**امباپرشاد**(مرادآباد) شیراز میں رہ پڑے اور تصوف کے رنگ میں ایسے ڈوبے کے **هـنـدی صـوفـی** کہلائے۔۱۹۵۹ء میں جب میں پہلی بار شیراز گیا تو کسی نے ان کی قبر کا پتا دیا جو **خواجہ کرمانی** کے مدفن کے پاس تھی۔

واپس آ کر **شیخ ضیاء الحق** نے انگریز سے صلح کر لی لیکن راجہ رئیسوں پر پمفلٹ کا وہ طومار باندھا کہ وہ پناہ مانگنے لگے۔اس مہم میں **دیوان سنگھ مفتون** سے ان کا یارانہ ہو گیا اور **خواجہ حسن نظامی** سے ٹھن گئی۔

دو دن کی ملاقات میں ان کی تین باتیں یاد رہ گئیں۔انھیں صفائی کا ایسا شوق تھا کہ صبح کاذب کے وقت **لال ٹین** جلا کر نوکروں کو آواز دیتے اور پھر جاروب کے زرّاٹوں اور پانی کے شرّاٹوں کا وہ شور اٹھا کہ نیند حرام ہو گئی۔جب پو پھٹی تو میں نے **مولوی صاحب** سے کہا: "چـلـیـے ذرا بـاهـر سیر کر آئیں"انھوں نے کہا:

اس کـا مـوقـع نهیـں هـے کیـوں که هر طرف بندر
مـورچـه تهـامـے بیـٹهے هوں گے اور جب تك شهر
میں جاگ نه پڑ جائے یه نهیں هٹیں گے۔

شیخ ضیاء الحق کے پاس اردو اخباروں اور رسالوں کا اپنا نادر مجموعہ تھا کہ میں نے اور کہیں نہیں دیکھا۔انیسویں صدی سے لے کر زمانہ حال تک کے ہزاروں فائل بڑے قرینے سے ان کے کتب خانے میں رکھے ہوئے تھے اور جب دونوں بھائی نجی باتوں میں مصروف ہوتے تو میں گھنٹوں ان کی ورق گردانی کیا کرتا تھا۔

سال بھر بعد **ضیاء الحق صاحب** کا انتقال ہو گیا اور یہ ذخیرہ ان کے گھر پر ہی رہا۔خبر نہیں، اب کس کی تحویل میں ہے؟

ساهتیه پرشد ناگپور کا جلسه

اپریل ۱۹۳۶ء کے آخری ہفتے کے مقررہ تاریخ کو میں **ڈاکٹر انصاری** کی کوٹھی پہنچا تو **مولوی**

صاحب کو موجود پایا۔ لاھور کے دورے کا حال سناتے ہوئے انھوں نے یک بیک کہا:

تمھارے بھائی تو بڑے کام کے آدمی ھیں۔ میں ان سے مل کر خوش ھوا، اور لاھور کے احباب کے مشورے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ انھیں اورنگ آباد بلالوں تاکہ انجمن کے منیجر کی ذمہ داری سنبھالیں۔

واقعتاً اس وقت انجمن کے انتظامی حالات دگرگوں تھے۔ **مولوی صاحب** کی عدم موجودگی اور مروّت سے کچھ لوگ اعلانیہ ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے اور وہ کسی دیانت دار منیجر کی تلاش میں تھے۔ چند ماہ بعد **شمیم صاحب** نے اپنا عہدہ سنبھالا اور ایسی جاں فشانی سے بدنظمی کی اصلاح کی جو ریاستی ماحول کے لحاظ سے قرینِ مصلحت نہ تھی۔ نتیجہ برایں **شمیم** دل برداشتہ ہوگئے اور دو سال بعد جب انجمن کا کاروبار دھلی منتقل ہوا تو وہ استعفیٰ دے کر بمبئی چلے گئے۔

ہماری ٹرین شام کو حیدر آباد جاتی تھی لہٰذا وقت کاٹنے کے لیے **مولوی صاحب** نے جامعہ ملیہ کا قصد کیا جو اس زمانے میں قرول باغ میں کرائے کے مکانوں میں واقع تھی۔ ہم **پروفیسر مجیب** کے گھر اُتر گئے اور انھوں نے ڈاکٹر **ذاکر حسین** وغیرہ کو خبر کردی۔ باتوں باتوں میں **ذاکر صاحب** نے کہا:

کل ناگپور میں گاندھی جی کا جلسہ ھے، آپ لوگ سرِ راہ کیوں وھاں ٹھھر نھیں جاتے۔

معلوم نہیں **مولوی صاحب** کو وہ دعوت نامہ یاد تھا یا نہیں۔ مجھے یاد ضرور تھا مگر میں نے دانستہ اس کا ذکر نہ کیا تھا کیوں کہ تا ایں دم **مولوی صاحب** **گاندھی جی** کے مدّاح تھے اور میں سخت بدظن تھا۔ غرض اس مشورے پر **مولوی صاحب** نے لبیک کہا کہ مختلف زبانوں کے دانش وروں سے ملاقات ہوجائے گی اور **گاندھی جی** سے بالمشافہ گفتگو کا موقع ملے گا۔

گاڑی دوسرے دن صبح اٹارسی جنکشن پہنچی جہاں الہ آباد کی ٹرین سے سنگم ہوتا تھا۔ اس میں سے **پنڈت نہرو** کے ہمراہ **منشی پریم چند** اور **اچاریہ نریندر دیو** کو برآمد ہوتے دیکھا۔ **پریم چند** نے مجھے

آواز دی اور احوال معلوم کر کے **پنڈت جی** سے میری ادبی سرگرمیوں کا تعارف کرایا۔ انھوں نے ہنس کر کہا: "میں ان حضرات کو دوسری حیثیت سے جانتا ہوں۔" پھر مزے لے لے کر وہ علی گڑھ کے اس سفر کا قصہ سناتے رہے اور چیں بہ جبیں ہو کر پوچھا:

تمھیں کچھ اور کرنا چاہیے۔ لغت نویسی
بوڑھوں کا کام ہے اور ریاست میں کسی آزاد
خیال کے لیے گنجایش نہیں۔

آچاریہ نریندر دیو کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے صدر اور مشہور ماہرِ تعلیم تھے۔ ہم اس طرح بلا ارادہ ناگپور پہنچے تھے کہ نہ کسی کو اطلاع دی تھی، نہ کہیں ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا۔ چناں چہ اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں ہی رہ گئے۔

ساھتیہ پرشد کے جلسے میں **گاندھی جی** نے جو گُل کھلایا وہ سب کو معلوم ہے اور اس کی جو روداد **مولوی صاحب** نے قلم بند کی تھی، وہ تاریخی دستاویز ہے۔ جب **گاندھی جی** نے ادبی مسائل سے صرفِ نظر کر کے لسانی بحث میں سارا دن لگا دیا اور جلسے کی فضا مکدر ہو گئی تو میں نے **پنڈت نہرو** سے بے زاری کا اظہار کیا۔ دوسرے دن ان کے مشورے پر ادیبوں کے فرائض کی تشریح کے لیے جو بیان تیار کیا وہ میری کتاب 'ادب اور انقلاب' کا پیش لفظ ہے۔ اس پر **مولوی عبدالحق**، **پنڈت نہرو**، **منشی پریم چند**، **آچاریہ نریندر دیو** اور میرے دستخط تھے۔ **گاندھی جی** نے ہماری اس تجویز کو نامنظور کر دیا کہ اس بیان کو جلسے کا فیصلہ تصور کیا جائے البتہ مجھے اسے پڑھ کر سنانے کی اجازت ضرور دی اور اس کے لیے کلمۂ خیر بھی کہا۔

جو بحث یہاں شروع ہوئی، اس نے آگے چل کر لسانی سیاست کی شکل اختیار کر لی اور لامحالہ قومی سیاست کا ضمیمہ بن گئی۔ اس کے بعد اردو کا تحفظ، مسلم لیگ کی سیاست کا ایک اہم نکتہ قرار پایا اور دوسری طرف سے ھندی، ہندو، ہندوستان کا نعرہ بلند ہوا۔

پہلے تو سمجھ میں نہ آیا کہ **گاندھی جی** نے خواہ مخواہ ھندی اردو کا قضیہ کیوں شروع کیا اور ادبی مسائل کی بجائے لسانی عداوت کیوں پیدا کی۔ بعد میں جا کر اصل بھید کھلا۔ **گاندھی جی** باخبر سیاست داں تھے لیکن ادبی اور ثقافتی معاملات میں ان کے مشیر کے **ایم منشی** اور **کاکا کالیکر** جیسے متعصب فرقہ پرست تھے

جن میں سے ایک گجراتی اور دوسرا مرہٹی کا نامی گرامی مصنف تھا۔انھوں نے **گاندھی** کو سمجھایا کہ ادب میں جدید خیالات عام ہو رہے ہیں اور اگر فوری طور پر ادیبوں کو کانگریس کے جھنڈے تلے جمع نہ کیا گیا تو وہ کسی اور طرف بہک جائیں گے۔ بنابریں **گاندھی جی** جلسے کی تشکیل کے لیے آمادہ ہوگئے۔اس کی تاریخ ھندی ساھتیہ سمیلن کے سالانہ جلسے کے ساتھ رکھی گئی جو ناگپور میں منعقد ہوا تھا۔اس طرح ساھتیہ پرشد کے جلسے میں ھندی کے طرف دار بڑی تعداد میں جمع ہوگئے اور پسِ پردہ یہ طے پایا کہ اِسی وقت طے کرالیا جائے کہ قومی زبان ھندی اتھوا (یعنی) ھندوستانی ہوگی۔ یہ تجویز کانگریس کے اُس فیصلے کے منافی تھی کہ قومی زبان ھندوستانی ہوگی جس سے مراد شمالی ھند کی وہ بول چال کی زبان ہے جو ھندی یا اردو میں لکھی جاتی ہے۔

بعد از خرابیِ بسیار۔ ۱۹۴۵ء میں **گاندھی جی** کو اپنی غلطی کا احساس ہوا ،اور انھوں نے ھندوستانی لٹریچر بورڈ کے قیام کا ارادہ کیا۔ بورڈ کے دس ارکان میں **ڈاکٹر تاراچند**، **پنڈت سندرلال**، **ڈاکٹر ذاکرحسین** وغیرہ کے ساتھ میرا نام بھی رکن اور سیکرٹری کی حیثیت سے شائع ہوا لیکن اب مصالحت کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ ہندو مسلم مفاہمت کے ایک بڑے پُل کو **گاندھی جی** نے ہماری نظر کے سامنے توڑ دیا تھا۔ جب کلچر اور ادب سیاست کے گرداب میں آتے ہیں تو انجام یہی ہوتا ہے۔

ساھتیہ پرشد کے جلسے نے **مولوی صاحب** کی زندگی اور انجمن کے لائحۂ عمل کو بدل کر رکھ دیا۔ حیدر آباد ہوتے ہوئے چندروز بعد ہم اورنگ آباد پہنچے تو سب سے پہلے **مولوی صاحب** نے اپنے کمرے سے چرخہ اٹھا کر ایک طرف کر دیا اور کھادی کے کپڑے تہ کر دیے، طاق سے وہ لُٹیا ہٹادی جو **لوک مانیہ تلک** کبھی سیاسی روپوشی کے زمانے میں چھوڑ گئے تھے۔ان کے چہرے پر نرمی کے بجائے سختی نمایاں ہوگئی تھی اور آنکھوں میں فکر کی بدلی کے بجائے عزم کی دھوپ چمکنے لگی تھی۔ کبھی افسوس اور کبھی غصے کے لہجے میں وہ بار بار کہتے تھے:

میں گاندھی کو بے ریا اور قومی اتحاد کا داعی
سمجھتا تھا لیکن وہ تو قومی زبان کو مٹانے کے
درپے ہے۔ اب ہمیں اُردو کی حفاظت کے لیے

ھرقسم کی قربانی دینے کا تھیہ کرنا ھے اور
انجمن کو فعال اور تنظیمی ادارہ بنانا ھے۔

اس کا عملی ثبوت انھوں نے یوں دیا کہ **انگریزی ھندی لغت** کے کام کو منسوخ کر دیا۔ اس سے کوئی خاص فرق نہ ہوا کیوں کہ یہ ابھی ابتدائی مرحلے میں تھا اور میں کچھ وقت سے انگریزی اردو ڈکشنری میں مصروف تھا۔ میں نے بمبئی سے **اندولال یاجنگ** کی کتاب *Gandhi as I know Him* منگوائی تو پڑھ کر دنگ رہ گئے اور بولے: "میں نہ جانتا تھا کہ گاندھی ایسا ابلہ فریب ھوگا۔" اس کا ترجمہ ہونا چاہیے۔ غرض یہ کہ **مولوی صاحب** کا ردِّعمل شدت اختیار کرتا گیا اور اُردو سے ان کی بے پایاں محبت کا تقاضا بھی یہی تھا۔

ایک تو میری دلچسپی یک سر علمی اور ادبی تھی جس میں زبان کی حیثیت وسیلۂ اظہار سے زیادہ نہ تھی۔ دوسرے اردو سے وابستگی کے باوجود ھندی سے عناد کا جذبہ نہ رکھتا تھا۔ میرا عقیدہ تھا کہ ہر دانش ور کو روز افزوں فرقہ پرستی کا مقابلہ کرنا چاہیے کیوں کہ یہ رجعت پروری کی بدترین شکل ہے۔ **مولوی صاحب** کا معاملہ اور تھا۔ انھوں نے **سرسید** کے زمانے میں ھندی اردو تصادم کی ابتدا دیکھی تھی اور **گاندھی** کے چیلنج کے خطرے کو سمجھنے کا زیادہ تجربہ رکھتے تھے۔

اسی وقت دو باتیں ایسی ہوئیں جنھوں نے مجھے چونکا دیا اور اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے پر مجبور کیا۔ **مولوی صاحب** نے ادبِ عالیہ کے سوشاہکاروں کو اردو میں منتقل کرنے کی اسکیم پر غور وخوض شروع کر دیا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ سال بھر بعد ڈکشنری کا کام ختم کر کے میں ہمہ وقت اسی طرف لگ جاؤں گا۔ مجھے اس تجویز میں ایسا انہماک ہوا کہ فرصت کا وقت فہرست بنانے میں صرف کرتا تھا۔ مگر ایک دن **مولوی صاحب** نے کہا: "فی الحال اس خیال کو ترک کرنا ھوگا۔" اس مایوسی کا داغ ابھی تازہ تھا کہ انھیں کہتے سنا:

اس کی طبیعت میں ایسی وحشت ھے کہ مجھے
دھڑکا لگا رھتا تھا کہ جانے کس دن اُٹھ کر چلا
جائے لیکن شادی کے بعد یہ کہیں نہیں جاسکتا۔

اس ایک جملے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ **شمیم صاحب** کی رضامندی سے میں نے رائے پور کی

جائیداد بیچنے کا فیصلہ کیا اور وہاں جا کر اسے اونے پونے بیچ دیا۔ سچ کہا ہے کہ "سب گھٹا دیتے ھیں مفلس کی غرض، مال کا مول" اگر کچھ وقت وہاں بیٹھا رہتا تو دوگنے دام ملتے لیکن ایسے کاموں کے لیے میرا مزاج موزوں نہیں ہے۔ بہرصورت اس بندھن کو توڑ کر جب حیدر آباد لوٹا تو چند ہزار روپے گرہ میں تھے جن میں سے آدھے بھائی کو بھیج دیے۔ میں دنیاداری سے ناواقف تھا مگر حوصلے اور جرأت کی کمی نہ تھی۔ اب وقت آ گیا تھا کہ آیندہ کے متعلق کوئی صاف وصریح پروگرام بنالوں۔ میں نے طے کیا کہ حیدر آباد چھوڑ کر دھلی چلا جاؤں اور وہاں سے اردو میں ایک نئے قسم کا ہفتہ وار اخبار نکالوں۔ میری سرشت میں ایسی گردش پرکار تھی کہ جہاں سکون سے بیٹھا وہاں خفقان اٹھنے لگا اور لطفِ خرام کو دل ترسنے لگا۔ بس حیدر آباد کی محفلوں سے جی اکتانے لگا اور ایک دن میں نے جی کڑا کر کے **مولوی صاحب** کو اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا۔

مجھے وہ شام یاد ہے حقے کا گہرا کش کھینچ کر وہ دیر تک خاموش رہے اور پھر کہا:

یہ سچ ھے کہ میرے اصرار پر یہاں آتے وقت تم نے صاف کہہ دیا تھا کہ دو سال سے زیادہ نہ رھو گے۔ مگر ابھی ۱۹۳۶ء کا آخر اور ڈکشنری کا مختصر ایڈیشن ختم کرنا ھے۔ بعد ازاں تصنیف وتالیف کے سلسلے میں انجمن کو تمھارے تعاون کی ضرورت ھوگی۔

میں نے یقین دلایا کہ دھلی سے میں یہ خدمت باقاعدگی سے انجام دیتا رہوں گا۔ اگر ابھی چلا جاؤں تو اخبار کے ابتدائی انتظامات میں آسانی ہوگی۔

ظاہر ہے کہ وہ میری ضد سے ناخوش ہوئے۔ انھوں نے مجھے اور **حمیدہ** کو وہ شفقت دی جو صرف باپ دے سکتا ہے اور ہم نے ان کا اتنا ہی احترام کیا لیکن بالآخر میں انجمن کا ملازم تھا اور مجھے معلوم تھا کہ آگے چل کر میرا نباہ نہ ہو سکے گا۔ مناسب یہی تھا کہ کسی اختلاف یا بدمزگی سے قبل کوئی اور راستہ اختیار کرلوں۔

دھلی پہنچ کر **شاہد احمد** کی مدد سے میں نے دریاگنج میں **سر بلند جنگ** کی کوٹھی میں فلیٹ

کرائے پر لیا اور اخبار کے لیے ڈکلریشن داخل کر دیا۔ اہل کاروں نے اسی وقت ہوشیار کر دیا کہ دارومدار حیدر آباد کی رپورٹ پر ہے اور اس کے آنے میں دیر لگے گی۔ **مولوی صاحب** کو اس امر کی اطلاع دے کر میں کچھ ڈکشنری کے کام میں اور کچھ مجوزہ اخبار کے معاملات میں مصروف ہو گیا۔

علی گڑھ کے دورانِ قیام سے **شاہد احمد** سے جو ادبی رفاقت شروع ہوئی وہ کراچی میں موسیقی کی محفلوں تک باقی رہی۔ جب کبھی میں دھلی میں کھاری باؤلی کی پُر پیچ گلیوں سے گزر کر ان کے بالا خانے پر پہنچتا تو ان کا چکور جو چوکیداری کے فرائض انجام دیتا تھا، فرطِ جوش میں مجھ پر حملہ آور ہوتا، کاتب آواز لگاتے کہ **اختر صاحب** آ گئے۔ ان سے مضمون وصول کیجیے اور **انصار ناصری**، **فضلِ حق قریشی**، **صادق الخیری**، جملہ احباب جمع ہو جاتے تھے۔ میرے کچے گانوں کے مقابلے میں **شاہد صاحب** کے پکے گانوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا تھا۔ دن بھر کی مضمون نگاری اور خوش گپی کے بعد ہم کباب کی تلاش میں جامع مسجد کی سیڑھیوں کی طرف چل پڑتے تھے۔ **شاہد احمد** کے 'ساقی' اور **صلاح الدین احمد** کے 'ادبی دنیا' نے اردو دانوں میں جو ذوق پیدا کیا اسے کیسے بھلایا جا سکتا ہے؟ ان دونوں کے خلوص کا میرے دل پر گہرا نقش ہے۔

دو ماہ کے انتظار کے بعد اخبار کے ڈکلریشن کی درخواست حکام نے مسترد کر دی اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حیدر آباد کی رپورٹ خاطر خواہ نہ تھی۔ یہ سن کر میرے اوسان گم ہو گئے۔

مولوی عبدالحق کی شخصیت کے بعض پہلو

مولوی صاحب کی ظاہری شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ان کی داخلی زندگی رازِ سربستہ رہ گئی۔ ان کے ہم نشیں یا تو اس کی کیفیتوں سے لاعلم رہے یا کسی مصلحت سے خاموش۔ اگر **مولوی صاحب** کی یادداشتیں دست بُردِ زمانہ سے بچ رہی ہیں تو شاید ان پر روشنی پڑے۔

عملی سیاست سے انھیں کوئی سروکار نہیں رہا۔ یوں عمر کا بڑا حصہ حیدر آباد جیسی ریاست میں بسر کرنے کی وجہ سے وہ لازماً وہاں کی سیاست کے مزاج سے خوب واقف تھے۔ اس کا ایک رُخ تھا برطانوی اقتدار اور نظام کی خود مختاری میں خاموش کش مکش۔ **میر محبوب علی خاں** کے انتقال کے وقت جب

وراثت کا مسئلہ چھڑا تو انگریز نے بے جا مداخلت کی کوشش کی اور چند محبانِ وطن موردِ عتاب ہوئے۔ مولانا **ظفر علی خاں** تو حیدر آباد سے رخصت کر دیے گئے اور **مولوی عبدالحق** کا تبادلہ اورنگ آباد کے ویران علاقے میں کر دیا گیا۔ مولوی **ظفر علی خاں** نے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے:

وہ کُہنی مارنے والوں کا ساتھ اگر دیتے
نظام آج نہ ہوتا غلام ٹامی کا

میر محبوب علی خاں نے اپنے اشعار میں کہیں کہیں انگریز کی غلامی سے نجات کی تمنا کا اظہار کیا ہے:

یہ کہہ رہی ہے پلٹ کر نگاہِ یار ابھی
زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی

مولوی صاحب کی سیاسی سوجھ بوجھ کا اصل جوہر دھلی آ کر کھلا جب انھوں نے اردو کی خاطر **گاندھی جی** سے مقابلے کے لیے مسلم لیگ کا تعاون حاصل کیا اور اہالیانِ حیدر آباد سے اس کا تعلق قائم کیا۔

میرا ذہن اس تجسس میں رہتا تھا کہ انجمن اور کوہ و دَمن کے اندر جو انسان چھپا ہوا ہے اُسے کسی ترکیب سے دیکھوں۔ سب جانتے ہیں کہ زمانۂ طالبِ علمی کی چند روزہ شادی اور طلاق کے بعد **مولوی صاحب** رشتۂ ازدواج کے پابند نہیں ہوئے۔ ایک بار سڑک پر شادی کا بینڈ بجا تو **مولوی صاحب** تالی بجا کر شور مچانے لگے: "اُلّو پھنسا، اُلّو پھنسا" اور میں نے پیپل کے سوکھے ڈنڈ کی طرف دیکھا تو انھوں نے ایک گندم نما جَو فروش کی طرف اشارہ کیا جو عقدِ ثانی کی تیاری کر رہا تھا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ **مولوی صاحب** عورت ذات کے خلاف تھے۔ البتہ وہ اس طوق کو ناپسند کرتے تھے جسے **شیخ سعدیؒ** از راہِ وضع داری سنتِ **رسول اللہ** کہہ کر زینتِ گردن بنائے رہے۔

ایک بار میں گراموفون خرید لایا تو **مولوی صاحب** نے اپنی تجوری سے کوئی شکستہ ریکارڈ نکالا اور کہا اسے بجاؤ۔ دکن کے شہر شولاپور کی **گوہر** نامی ممتاز گلوکارہ کا یہ گیت تھا۔ آواز میں کیا موہنی تھی، اظہار میں کیا کسک تھی۔ خاموشی سے دو تین بار اسے سن کر انھوں نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا: "اس ریکارڈ کو تم رکھ لو۔" وہ یادگار اب تک میرے پاس محفوظ ہے:

عالمِ ہُو میں اک آواز سی آجاتی ہے

چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

یہ سوچا بھی نہ تھا کہ حیدر آباد میں تحریر اور تقریر کے بے محابا استعمال کا یہ انجام ہوگا۔ جامعہ عثمانیہ کے کئی روشن دماغ طلبا پر ان کا اثر ضرور ہوا تھا جن میں **مخدوم محی الدین** سے میری دوستی اسی نوعیت کی تھی جیسی علی گڑھ میں **مجاز** سے بعد میں **مخدوم** صرف قلم نہیں بلکہ عمل کے بھی دھنی ثابت ہوئے۔ جامعہ کی سیاست کی وجہ سے **مولوی صاحب** ان سے ناراض تھے اور مجھے ان کی ملاقات سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہماری بیٹھک کبھی **بابا** کے فلیٹ میں ہوتی یا عابد روڈ کے کسی چائے خانے میں۔ اس طرح ہم نے ایک ادبی انجمن کی طرح ڈالی جسے حیدر آباد کی ترقی پسند تحریک کا سنگِ بنیاد سمجھنا چاہیے۔

اخبار کا جو سراب مجھے دھلی لے آیا تھا آنکھ سے اوجھل ہو چکا تھا اور مجھے کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا تھا۔ یہی وہ موقع تھا جب **سجاد ظہیر** سے دھلی میں ملاقات ہوئی۔ اس کا تذکرہ انھوں نے 'روشنائی' میں کچھ اس انداز میں کیا ہے:

> اختر حسین سے ملاقات ہوئی جو مولوی عبدالحق سے لڑکر دھلی آگئے تھے۔ وہاں کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے معاملات سے میں مطمئن نہ تھا، ان سے کہا کہ اس کی ذمے داری سنبھال لیں لیکن وہ تیار نہیں ہوئے کیوں کہ انھیں بڑا آدمی بننے کی دُھن تھی۔

تعجب ہے کہ **سجاد ظہیر** جیسے سنجیدہ آدمی کے قلم سے ایسی چھوٹی بات نکل گئی۔ میں نے عذر میں ان سے یہی کہا تھا کہ میں دھلی سے جلد چلا جاؤں گا کیوں کہ وہاں رہنے کا اب کوئی جواز نہیں ہے۔

اپریل میں **مولوی صاحب** شمال کے سالانہ دورے پر آئے اور دھلی میں میرے غریب خانے پر قیام فرمایا۔ جب میں حیدر آباد واپس جانے کے لیے آمادہ نہ ہوا تو انھوں نے ناراضگی کا اظہار نہ کیا بلکہ ازراہِ التفات امید دلائی کہ انجمن کو تصنیف و تالیف کے سلسلے میں ہمیشہ میرے تعاون کی ضرورت ہوگی۔

مولوی عبدالحق کا چڑیا گھر

مولوی عبدالحق کی شخصیت میں بڑا تنوع تھا۔ متاہلِ زندگی سے کنارہ کشی کے باوجود اُن میں زندگی اور جولانی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اچھے کھانوں کا شوق، مطالعے کا ذوق، حسِ مزاح، سیر وتفریح، جانوروں سے لگاؤ اور کئی ایسے دلچسپ مشغلے تھے جن میں **مولوی صاحب** اور میرے مزاج میں ہم آہنگی اور یکسانیت تھی۔ ایک مضمون 'مولوی عبدالحق کا چڑیا گھر' کئی سال پہلے میں نے رسالہ اوراق (لاھور) کے لیے لکھا تھا اُسے اس کتاب کا حصہ اس لیے بنا رہا ہوں کہ **مولوی صاحب** کی شخصیت کے اُس رُخ پر آج تک کسی نے کچھ نہیں لکھا۔

حیدر آباد دکن میں **مولوی عبدالحق** صبح سویرے بلا ناغہ سیر کو نکلتے اور اپنے بندھے ہوئے راستے پر حسین ساگر کی طرف چل کھڑے ہوتے۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ ایک بار انھوں نے باغِ عامہ کی طرف جانا شروع کر دیا۔ گو یہ جگہ اُن کی قیام گاہ سے زیادہ دور نہ تھی۔ باغِ عامہ میں داخل ہو کر وہ تیز تیز اس طرف پہنچتے جہاں کچھ شیر کٹہروں میں بند تھے اور ان میں سے ایک کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ اس میں ایک شیرنی بند تھی جو آہنی تیلیوں کے پاس آ کر **مولوی صاحب** کو غور سے دیکھتی اور غرّا کر کچھ پوچھتی۔ حال ہی میں اس نے دو بچے دیے تھے اور رکھوالا انھیں جنگلے سے نکال کر ہمارے پاس چھوڑ دیتا۔ اب **مولوی صاحب** کی باچھیں کھل جاتیں اور وہ دیر تک ان سے کھیلتے رہتے۔ یہ ان کے مزاج کا ایک نیا رُخ تھا جس سے میں پہلے واقف نہ تھا۔ بہرحال میں زیادہ زور شور سے اس کھیل میں شریک ہو جاتا حتیٰ کہ ہم میں سے کسی کی ٹھوکر بچے کو لگتی اور وہ درد سے چیخ اٹھتا۔ شیرنی جو ہماری حرکتوں کو ناپسندیدگی سے دیکھتی ہوئی جنگلے میں جوش سے اُچھل رہی تھی اب غصے سے دہاڑ اٹھی۔ رکھوالا ہنستا رہا اور بچے کو گود میں اٹھا کر ماں کے پاس لے گیا۔ **مولوی صاحب** نے چھڑی سنبھالی اور کہا چلو اب کل آئیں گے۔

میں نے نہ دیکھا نہ سنا کہ انھیں جانوروں سے کس قسم کی دلچسپی تھی لیکن **مولوی صاحب** کہنے لگے:

یہ بات نہیں۔ مدت ہوئی (یعنی اول جنگِ عظیم

سے پھلے) جب میں اورنگ آباد میں نگرانِ تعلیم تھا تو ایك السیشن کتّا پال لیا تھا۔ اس سے مجھے از حد اُنس ھوگیا۔ تم نے مقبرے کا بنگلہ دیکھا ھے کہ وہ آبادی سے کس قدر ھٹ کر ھے۔ اس زمانے میں وھاں مستقل قیام تھا۔ وھاں کی تنھائی میں وہ کتّا میرا تنھا رفیق تھا اور ھمیشہ سائے کی طرح میرے ساتھ ھوتا تھا۔ ایك بار کوئی شکاری جنگل سے ننھی سی شیرنی پکڑلایا اور خواہ مخواہ میرے پاس چھوڑ گیا۔ اس کے لیے میں نے بھت بڑا پنجرا بنایا اور اس کی خدمت پر ایك آدمی تعینات کردیا۔ دیکھتے دیکھتے شیرنی بڑی ھونے لگی اور مجھے اس سے بھی تھوڑا سا لگاؤ ھوگیا۔ مگر کتّا اُسے ایك آنکھ نہ بھاتا تھا اور نہ کتّے کو اس کی موجودگی گوارا تھی۔ یہ دن میں اس پر دس بار بھونك آتا اور شیرنی وقت بے وقت اسے ڈپٹ دیتی تھی۔ میں نے ان میں صلح وآشتی کے لاکھ جتن کیے لیکن سب بے سود۔ ابھی سوچ رھا تھا کہ اس قضیے کا فیصلہ کس طرح ھو کہ ایك روز موت کتّے کو جنگلے کے قریب لے گئی اور شیرنی نے پنجے سے اس کی گردن کو پکڑ کر اس طرح مروڑا کہ وہ مرگیا۔ میں نے آکر دیکھا کہ وہ خونم خون بے جان پڑا ھوا تھا۔ افسوس ھوا۔ پھر میں نے شیرنی

کو باغِ عام بھیج دیا اور تھیہ کیا کہ آیندہ کوئی
جانور نہ پالوں گا۔

جب کبھی **مولوی صاحب** کو کوئی ایسا واقعہ یاد آتا تو ان کی آنکھوں کی سفیدی زیادہ پھیل جاتی اور وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ واپسی کے وقت ان پر یہی کیفیت طاری تھی۔ یک بیک مجھے ان کی تنہائی کا شدید احساس ہوا، اور میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ ان کے لیے کہیں سے کوئی اچھی نسل کا کتّا لاؤں گا۔

اتنے میں **مولوی صاحب** نے کہا:

کیا عجب کہ یہ وہی شیرنی ہو" میں نے جواب
دیا: "بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ شیر کی عمر پندرہ
بیس سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔
اگر وہ نہیں تو اس کی بیٹی ہوگی۔ شکل اُس
سے ملتی ہے۔

مولوی صاحب کبھی کبھی بھولی بھالی باتیں کہہ جاتے تھے کیونکہ ان کی پیرانہ سالی میں طفلانہ معصومیت کا پرتو باقی تھا۔

ان کے مکان کے آگے پیچھے بہت بڑا احاطہ تھا اور سامنے پیس کے دو اونچے اونچے پیڑ پہرا دے رہے تھے۔ ان کے تنوں کے اردگرد میں نے لوہے کی جالی بچھا دی اور یہاں وہاں سے رنگ برنگ پرندے منگوا کر چھوڑ دیے۔ **مولوی صاحب** اس انتظام سے خوش ہوئے اور روز گھڑی دو گھڑی اس کا تماشا کرنے لگے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ پرندوں کو بند نہیں کرنا چاہیے۔ اس مضمون پر **اقبال** کی وہ نظم 'پرندے کی فریاد' خوب ہے۔ اردو شاعروں میں وہ سب سے زیادہ **حالی** اور **اقبال** کے قائل تھے۔

اتنے میں خبر ملی کہ **قاضی عبدالغفار** کی کُتّیا نے بچے دیے ہیں۔ اس زمانے میں **قاضی صاحب** حیدر آباد سے روزنامہ پیام نکالتے تھے۔ گو انھوں نے کُتّیا کا نام **موتی** رکھا تھا مگر تھی وہ ولایتی۔ اسپیشل نسل کی اور سج دھج میں کسی انگریز میم سے کم نہ تھی۔ **قاضی صاحب** بذاتِ خود اس کی خدمت

اور بناؤ سنگھار میں مصروف رہتے تھے۔ اس کا ایک بچہ مجھے پسند آیا اور جب وہ کچھ بڑا ہوا تو میں نے اسے مانگ لیا۔ اس کے نرم نرم سفید اور کالے گھنگھریالے بال اور مہر و وفا میں تیرتی ہوئی آنکھیں مجھے اب تک یاد ہیں۔

مولوی صاحب اسے دیکھتے ہی خوشی سے اُچھل پڑے۔ نہایت احتیاط سے انھوں نے اُسے چھوا، اور کہنے لگے: بے شك اچھی ذات کا ھے۔ اس کا نام اچھا سا ھونا چاھیے۔

میں نے کئی نام تجویز کیے لیکن انھیں کوئی نہ بھایا اور اپنی طرف سے اسے **نازی** کا لقب دے دیا۔ میں نے لاکھ بحث کی کہ **نازی** تو نہایت ظالم اور جفا پرور ہیں، اس غریب کو ان سے کیا نسبت لیکن **مولوی صاحب** کو یہی نام پسند اور ہم سب اسے **نازی** کہہ کر پکارنے لگے۔

جب **نازی** کی ٹانگوں میں سکت آئی تو اس نے چل کر اندرونِ خانہ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ ایک کمرے میں **مولوی احتشام الدین**، **شان الحق حقی** کے والد مرحوم، اردو لغت کی تدوین میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ جب **نازی** نے انھیں مخاطب کرنے کی کوشش کی تو انھوں نے ایسی جریب تانی کہ وہ دُم دَبا کر دُہائی دیتا ہوا بھاگا۔ دوسرے کمرے میں جھانکا تو کیا دیکھتا ہے کہ **ڈاکٹر عباد صاحب** انگریزی اردو ڈکشنری کی ترتیب میں مشغول ہیں۔ انھوں نے ہکلائی ہوئی آواز میں **نازی** کو اس زور سے ڈانٹا کہ وہ دم بخود رہ گیا۔ اب اُسے پتا چلا کہ اس جگہ اس کے سرپرست دو ہیں۔ ایک **مولوی عبدالحق** اور ایک میں۔ یوں اپنی طرف سے میں نے اسے باور کرایا تھا کہ اس کے اصل مالک **مولوی عبدالحق** ہی ہیں اور باقی وقت اسے اُنہی کی خدمت میں گزارنا ہے۔

صبح کے ناشتے کے بعد جب **مولوی صاحب** اپنے کتب خانے میں داخل ہوتے تو **نازی** بھی ان کے پیچھے لگ لیتا اور چپ چاپ ان کی کرسی کے پیچھے بیٹھ جاتا۔ **مولوی صاحب** کام میں مصروف ہو جاتے اور یہ آنکھیں بند کر کے کسی نامعلوم فکر میں محو ہو جاتا۔ اتنے میں ملازم حقہ لے آتا اور **مولوی صاحب** کش پر کش اڑانے لگتے تھے۔ **نازی** کو یہ حرکت سخت ناگوار تھی۔ حقے کے بول پر پہلے وہ بہت چونکا کہ شاید یہ کسی جانور کی آواز ہے۔ دُھواں الگ اسے پریشان کرنے لگا اور اس نے اتنا واویلا مچایا کہ **مولوی صاحب** نے دِق آ کر اسے کمرے سے نکال دیا۔ اس کے بعد **نازی** زیادہ چوکس ہو گیا۔ اب **مولوی صاحب** کے پلنگ کے نیچے اُس وقت لیٹتا جب وہ خود آرام کرنے لگتے۔ آہستہ آہستہ وہ اس سے

کچھ کہتے اور **نازی** کے کان فرطِ مسرت سے کھڑے ہو جاتے تھے۔

دور سے دیکھو تو **نازی** پر بھیڑ کے بچے کے گمان ہوتا تھا۔ **مولوی صاحب** اس کی طرف گیند اچھالتے تو وہ پوستین کے بار کے باوجود بجلی کی طرح اس پر لپکتا اور پھرتی سے اسے پنجوں میں دبوچ لیتا۔ کبھی اسے شبہ ہوتا کہ اس کی دم جسم سے الگ کوئی چیز ہے اور وہ بار بار چکر کاٹ کر اسے پکڑنے کی ناکام کوشش کرتا۔ پھر وہ باغ کے کسی کونے کا رُخ کرتا جہاں اس نے ہڈیوں کا دفینہ دبا رکھا تھا اور دیر تک ان پر دانت تیز کرتا رہتا۔ غرض **نازی** کی شرارتوں میں دلچسپی کے کئی پہلو تھے۔

اُنہی دنوں مجھ سے ایک غلطی سرزد ہوئی۔ شام کو میں اکثر **مسز سروجنی نائیڈو** کے دولت کدے کی طرف جا نکلتا تھا۔ انھوں نے ایک حسین و جمیل سیامی **بلّی** پال رکھی تھی اور حال ہی میں **بلّی** کے یہاں خوشی ہوئی تھی۔ **مسز نائیڈو** نے کہا: "ان میں سے ایک بچہ لے جاؤ۔" دیکھتا کیا ہوں کہ ماں سے اس کی شکل بالکل نہیں ملتی۔ نرا سیاہ فام کالے دیو کی اولاد لیکن **مسز نائیڈو** نے یقین دلایا کہ ہر بچہ شروع میں بدصورت لگتا ہے بڑا ہو کر صورت شکل نکالتا ہے، غرض کہ شرما حضوری میں اس کالے کلوٹے کو بغل میں داب کر لے آیا۔

اسے دیکھتے ہی **نازی** نے نعرۂ احتجاج بلند کیا اور **مولوی صاحب** نے بھی ناخوشی کا اظہار کیا:

لاحول ولا قوۃ، بلی بھی کوئی پالنے کی چیز ھے
اور بھلا کتے بلی کا نباہ ایک گھر میں کیسے
ھوسکتا ھے۔ اسے فوراً واپس کردینا چاھیے۔

بلّی کا بچہ مسکین صورت بنائے ٹوکری میں بیٹھا خوف و ہراس کے عالم میں ہماری باتیں سن رہا تھا۔ اس کی طرف داری میں کئی خیال تراشے۔ **سیامی بلی** کی زیبایش کی ثناخوانی کی اور گربہ پروری کے ثواب گنائے۔ **عبدز اکانی** کی نظم 'گربہ و موش' اس وقت تک نظر سے نہ گزری تھی لیکن **کیتھرین مینسفیلڈ** (katherine mansfield) کا مضمون **بلّی** کی تعریف میں یاد دلایا جسے **مولوی صاحب** بھی ملاحظہ فرما چکے تھے۔ جب **مولوی صاحب** کسی طرح قائل نہ ہوئے تو میں نے نوکروں کی شہادت پیش کی جس کے مطابق کتب خانے میں چوہوں کی موجودگی کے آثار پائے جاتے تھے۔ یہ سنتے ہی **مولوی صاحب** نے اپنے اعتراض واپس لے لیے اور اس طرح وہ بلا ان کے خانوادے میں شامل

ہوگیا۔

مولوی صاحب کے مشورے کے بغیر میں نے اس کا نام **لاما** رکھ دیا۔ مجھے یقین تھا کہ بڑا ہوکر وہ بھی تبتی **لاماؤں** کی طرح گول مٹول تازہ ہوگا۔ ابھی تو وہ لاغر ونحیف تھا اور اس کی شکل پر عبرت وحسرت کے ایسے آثار تھے کہ اگر کوئی ۱۹۴۷ء میں دیکھتا تو اسے مہاجرین کے قافلے کا جواری سمجھتا۔

ہم نے **لاما** کی پرورش میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ **نازی** کی دست درازی سے اسے ہمیشہ محفوظ رکھا اور بے صبری سے اس دن کا انتظار کیا جب وہ بڑا ہوکر **سیامی** رنگ روپ کا جلوہ دکھائے گا مگر افسوس کہ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی بدصورتی میں اضافہ ہوتا گیا۔ نہ اس کا قد بڑھا نہ بال، ایک رنگ کا کالا پن تھا جو روز بروز گہرا ہوتا چلا گیا۔ اس کا باپ ضرور کوئی حبشی بلا تھا اور یہ ہو بہو اسی پر ہوا تھا۔ اس کی سراسیمگی کی اصل وجہ یہی تھی کہ وہ اس راز کو زیادہ دیر چھپا نہ سکتا تھا۔

اب گھر میں **لاما** کی کوئی ساکھ نہ تھی۔ ہر کوئی اسے دُھتکارتا اور **نازی** بے روک ٹوک اسے کھدیڑتا تھا۔ پناہ یا تو اسے **مولوی احتشام الدین** کے کمرے میں ملتی تھی جہاں وہ کسی موٹی سی **لغت** کے پیچھے چھپ کر بیٹھ جاتا اور یا وہ کبھی میری میز پر اچک کر بیٹھ جاتا اور آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں اپنے خدا کو یاد کرنے لگتا۔

لاما کو ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ **مولوی صاحب** کبھی اس طرف التفات کریں۔ آخر یہ اسی کے دم قدم کی برکت تھی کہ کتب خانے سے **چوہے** یکسر غائب ہوگئے۔ اس خدمت سے **مولوی صاحب** یقیناً خوش ہوئے بلکہ ایک بار جب **لاما** کی دیکھا دیکھی **نازی** نے کتابوں کی الماری میں گھسنے کی کوشش کی تو **مولوی صاحب** نے ایک بید رسید کیا۔ یہ نظارہ قابلِ دید تھا۔ **مولوی صاحب** کے ہاتھوں **نازی** کبھی نہ پٹا تھا اس لیے اس کی آنکھوں میں شکایت کے آنسو اُمڈ آئے اور **لاما** کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

اس مستعدی کا صلہ **لاما** کو یہ ملا کہ اب وہ بھی **نازی** کے ساتھ **مولوی صاحب** کے دسترخوان کا خوشہ چیں ہوگیا۔ ان کی کرسی کے ایک طرف **نازی** اور دوسری طرف **لاما** آسن جماتا اور **مولوی صاحب** روٹی کا ایک ٹکڑا کبھی اِدھر کبھی اُدھر ڈالتے جاتے۔ زیادہ توجہ **نازی** کی جانب ہوتی اور ترنوالہ اسے ہی ملتا تھا لیکن **لاما** پنجے سے **مولوی صاحب** کی ٹانگ کو ٹھوکے دے کر اپنی موجودگی سے آگاہ کرتا رہتا اور اس طرح اپنا حصہ وصول کر لیتا تھا۔

نازی نے جیسے ہی محسوس کیا کہ **مولوی صاحب لاما** سے شفقت نہیں بلکہ رواداری کا تعلق قائم کررہے ہیں تو اس کا جذبۂ انتقام جاگ اٹھا اور وہ اس کی جان کا لاگو ہوگیا۔ اس طرح رگیدا کہ گھر میں داخلہ مشکل کردیا۔ مجبور ہوکر **لاما** نے باغ میں سکونت اختیار کرلی۔ گھاس پر لیٹے لیٹے وہ گھنٹوں **پرندوں** اور **تتلیوں** کو دیکھا کرتا۔ یا تو وہ کھانے کی آہٹ سن کر اندر آتا اور یا رات کے وقت جب اس کی رنگت شب کی سیاہی میں اس طرح گھل مل جاتی تھی کہ تلاش کے باوجود اس کا پتا نہ چل سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ **لاما** بہت چالاک ہوگیا اور اسے اندازہ ہوا کہ **نازی** کی وجہ سے اس کی حق تلفی ہورہی ہے۔ اب اس نے بقا کے لیے جدوجہد کا فیصلہ کرلیا اور وہ داؤں گھات استعمال کیے جو اسے حبشی باپ سے ورثے میں ملے تھے۔ کبھی تو وہ صوفے کے نیچے چھپ جاتا اور جہاں **نازی** کی رسائی نہ ہوسکتی تھی۔ یہ اگر اپنا منہ اندر کرتا تو اس کی ناک نوچ لیتا اور جب تک یہ اپنی ناک سہلائے یک بیک باہر نکل، اس کی ٹانگ پر پنجہ مار یہ جا وہ جا باہر نکل بھاگتا تھا۔ جب **نازی** باغ میں اس کا پیچھا کرتا تو وہ دیر تک اسے چکمہ دے کر ایک طمانچہ رسید کر، ایک جست میں کسی درخت پر چڑھ جاتا تھا۔ اب تو **نازی** کے غصے کی حد نہ رہتی اور وہ اس زور سے بھونکتا کہ سب چونک جاتے۔ **مولوی صاحب** بگڑ کر کہتے کہ ساری شرارت اس **لاما** کی ہے۔ وہ پیار سے **نازی** کو تھپک کر **لاما** کو گھونسا دکھاتے جو پیڑ پر بیٹھا انھیں منہ چڑا رہا تھا۔

اس سینہ زوری کا الٹا اثر ہوا، اور **لاما** سمجھ گیا کہ اس گھر میں اس کا کوئی ہمدرد و خیر خواہ نہیں۔ جب چھوٹا تھا تو صبح و شام اسے دودھ ملائی ملا کرتی تھی اور **نازی** کے ظلم و ستم سے سب اس کی حفاظت کرتے تھے، مگر جب بڑا ہوا تو سب نے منہ موڑ لیا لہٰذا **لاما** نے بچاؤ کی ایک نئی ترکیب سوچی۔

آس پاس کی کوٹھیوں میں کئی آوارہ **بلّے** رہتے تھے۔ دن بھر وہ تلاشِ معاش میں سرگرداں رہتے لیکن رات کو کسی کھلی جگہ مل بیٹھتے اور دنیا والوں کی سفاکی اور بے رحمی پر بانگِ دہل تبصرہ کرتے۔ معلوم نہیں کب **لاما** اس غول میں شامل ہوگیا۔ ہمیں تو پتا اس رات کو چلا جب باغ کے درختوں سے یک بیک **بلّوں** کا دل خراش کورس سنائی دیا۔ یہ گویا ایک جنگی ترانہ تھا جو تیز سے تیز تر ہوگیا۔ پہلے للکار پھر متواتر چیخ۔ دم بھر میں در و بام اس گھن گرج سے گونج اٹھے۔ ہم حیران ہوکر درختوں کو تاکنے لگے کہ ماجرا کیا ہے؟ اتنے میں بجلی کی ایک ہلکی سی روشنی میں **لاما** کی چھب نظر آئی کہ جوش و خروش سے الاپ میں مصروف تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اُس کورس کا مکھیا تھا کیوں کہ اس کے اشاروں پر کورس کے سُر کبھی

نیچے اور کبھی اونچے ہو جاتے تھے۔

اس تماشے پر **مولوی صاحب** بے اختیار ہنس پڑے۔ **بلّوں** کو بھگانے کے لیے وہ ہو حق کرنے لگے اور ہم نے سنگ باری کی۔ دوسرے دن صبح جب **لاما** ناشتے کی میز پر حاضر ہوا تو نہ اس نے ندامت کا اظہار کیا اور نہ **مولوی صاحب** نے خفگی ظاہر کی بلکہ اس پر خاص عنایت کی۔ کہنے لگے کہ یہ بڑا بدذات ہے۔ اگر اس کا دوزخ نہ بھرا تو زیادہ تنگ کرے گا۔

جب یہ خبر مشتہر ہوئی کہ **مولوی صاحب** کو جانور پالنے کا شوق ہے تو کوئی شناسا ان کے لیے **ھرن** کا جوڑا لے آیا۔ یہ دونوں ابھی کم عمر تھے۔ انھیں کوٹھی کے بچھواڑے چھوڑ دیا گیا۔ یہاں وہ بے خطر چرتے چگتے کلیلیں کرتے پھرتے تھے لیکن جیسے ہی کسی نے ان کی طرف دیکھ وہ چوکنّا ہوئے اور دوسری طرف بھاگ نکلے۔

چند روز تو **مولوی صاحب** ان کی خبر گیری کرتے رہے لیکن پھر بے زار ہو کر کہنے لگے:

بھئی ھرن کی فطرت میں بڑی وحشت ھوتی ھے۔
یہ کسی کا دوست نھیں۔ جنگل کی آب وھوا راس
آتی ھے اور بس اسے پالنا لاحاصل ھے۔

ہم جب کام کرتے کرتے تھک جاتے تو کتاب خانے کے برآمدے سے کھڑے کھڑے ان وحشیوں کو دیر تک دیکھتے رہتے اور **میر** کا یہ شعر گنگنانے لگتے:

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھ طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے ان اچھی آنکھوں والوں کا

غزل کی شاعری **مولوی عبدالحق** کو پسند نہ تھی۔ البتہ انھیں **میر** سے عقیدت تھی اور بے خیالی میں ان کا کوئی شعر زبان پر آ جاتا تھا۔ یوں تقریر و تحریر میں وہ شعر کو داخل نہ ہونے دیتے تھے۔

شام کو **مولوی صاحب** عموماً گھر پر ہوتے تھے اور یہی وقت تھا کہ لوگ ان سے ملنے آتے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے اور جانے کے بعد وہ باغ میں چہل قدمی کرتے تھے۔ کبھی وہ پرندوں کے پنجرے کے پاس جاتے اور پَل بھر ان کا زمزمہ سنتے۔ پھر پیچھے کے میدان میں **ھرنوں** کی ٹوہ لیتے جو کان جوڑے جگالی کر رہے تھے۔ بعد میں وہ آرام کرسی پر بیٹھ کر حقہ پیتے ہوئے کسی کتاب کے مطالعے

میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اب انھیں اکیلے پن کا احساس نہ تھا کیوں کہ **نازی** قدموں پر سر جھکائے بیٹھا تھا اور نزدیک کہیں **لاما** چل پھر رہا تھا۔ یہ محفل جلد درہم برہم ہوگئی جب میں کچھ عرصے بعد حیدر آباد سے یورپ چلا گیا اور **مولوی صاحب** انجمن ترقی اردو کے دفتر کے ساتھ دھلی آ گئے۔

مدتوں بعد ایک بار جب اس زمانے کا ذکر آیا تو ان کی آنکھوں کی سفیدی پھیل گئی۔ انھوں نے حقے کا کش زور سے کھینچا اور دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔

میرے دوسرے محسن **بابو مول چند اگروال** کو ھندی سے میری دوری پسند نہ آئی تھی۔ جب انھیں خبر ہوئی کہ میں دھلی میں کس طرح زچ ہو گیا ہوں تو لکھا کہ کلکتہ آ جاؤ اور جی چاہے تو ھندی ماہنامے 'وشوامتر' کی ادارت سنبھالو یا انگریزی روزنامے 'ایڈوانس' میں کام کرو۔

کچھ وقت اسی حیص بیص میں گزر گیا کہ ایک دن اچانک **حمیدہ** نے کہا:

تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ چلو یورپ چلے
چلیں۔ وھاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے آؤ گے تو
کام کی کمی نہیں رہے گی۔

میں اس کی شکل دیکھتا رہ گیا کیوں کہ یہ خیال کبھی میرے دماغ میں نہ آیا تھا۔ ہماری شادی کو سال بھر ہوا تھا اور وہ دنیاداری سے میری طرح بے خبر اور حوصلہ مندی میں میری ہم سر تھیں۔

انگستان کی طرف دل یوں مائل نہ ہوا کہ جہاں رنگ و نسل کا تعصب ہو وہاں رہنا میری غیرت قبول نہیں کرتی اور پھر برطانوی سامراج کی چیرہ دستی سے بھی ایسی شدید نفرت تھی کہ اس کے گڑھ میں زیادہ وقت گزارنا بھی پسند نہ تھا۔ بنابریں، میں نے فرانس جانے کا تہیہ کیا جو صدیوں سے ادب و فن کا گہوارہ تھا اور اب متحدہ محاذ کی حکومت کے دور میں فاشسٹ دشمن اور ترقی پسند تحریک کا مرکز تھا۔ پیرس یونیورسٹی کا وقار دنیا کی قدیم ترین دانش گاہوں میں مسلم تھا۔ فرانسیسی زبان کی لاعلمی مانعِ راہ نہ تھی کیوں کہ مجھ میں زبان سیکھنے کی فطری صلاحیت تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بہت کم ہندوستانی مغرب کا سفر کرتے تھے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ جانے والوں کی تعداد اور بھی کم تھی۔ اگر یونیورسٹی کی مناسب سند ہو تو داخلہ بلا دقت مل جاتا

تھا۔ فارن ایکسچینج کی کوئی پابندی نہ تھی۔ جتنے روپے چاہیے منی آرڈر سے دنیا کے کسی گوشے میں بھیج دیں یا بینک کے ذریعے بلاتردد روانہ کردیں۔ صحت کے سرٹیفکیٹ کا نام بھی نہ سنا تھا، ہر مسافر صحت مند سمجھا جاتا تھا۔ جس پاسپورٹ پر حکومتِ برطانیہ کی مہر لگی ہو اس پر بلاتوقف سرحد پر ویزا مل جاتا تھا۔ ارزانی ایسی تھی کہ بیس پونڈ یعنی تین سو روپے میں مہینہ آرام سے کٹ جاتا تھا اور فرانس میں تو ہر قسم کی تعلیم مفت تھی۔ البتہ روپیہ آج سے کم از کم دس گنا مہنگا تھا۔ بیرونی تعلیم کے لیے اسکالرشپ کوئی نہ دیتا تھا، خاص کوشش سے راجہ رئیس کسی کو نواز دیں تو اور بات ہے۔ **مسز سروجنی نائیڈو** کے اصرار پر ٹراونکور ریاست کے دیوان **سر رام سوامی ایئر** نے وظیفہ دینے کا حتمی فیصلہ بھی کیا لیکن عین موقعے پر کمند ٹوٹ گئی اور میں دیوار سے گرتے گرتے بچا۔ **علامہ اقبال** کی سفارش اور **نجیب اشرف ندوی** کی کوشش کے باوجود بمبئی کے **فضل بھائی** تعلیمی ٹرسٹ نے بات اَن سنی کردی۔ گرہ میں چند ہزار روپے تھے جو مشکل سے سال بھر کی کفالت کرتے۔ بس قلم پر بھروسا تھا۔

سب سے مشکل پاسپورٹ کا مسئلہ تھا۔ حکومت کی نظر میں کچھ ایسا ہی معتوب تھا کہ **ظفر عمر صاحب** بھی بے بس ہوگئے۔ میں مایوس ہوگیا تھا کہ وسط ۱۹۳۷ء میں یوپی میں کانگریس کی وزارت نے قلم دان سنبھالا اور **پنڈت پنت** وزیرِ اعلیٰ مقرر ہوئے۔ **مسز نائیڈو** اور **ڈاکٹر راجندر پرشاد** نے جب انھیں متواتر تار بھیجے تو **پنڈت پنت** کی مداخلت کے بعد روانگی سے چند روز قبل ہمیں پاسپورٹ وصول ہوئے۔

اگست کے آخر میں بمبئی سے ہمارا جہاز روانہ ہونا تھا۔ **مسز نائیڈو** نے ہدایت کی کہ سرِ راہ وردھا میں **گاندھی جی** کے درشن کرلو کیوں کہ ساتھیہ پرشد کے جلسے کے بعد وہ تم سے ملنے کے خواہاں ہیں۔ ان کے ارشاد کی تعمیل ضروری تھی۔

گاندھی جی کے درشن

وردھا شہر کے پاس سیوا گرام میں **گاندھی جی** کا آشرم تھا۔ وہاں پہنچنے کے لیے یا تو بیل گاڑی سے سفر کرنا ہوتا تھا یا پیادہ۔ ہم جیسے شہری مہمانوں کو ایک صاف وسادہ مکان میں ٹھہرایا جاتا تھا ورنہ دیش بھگت قسم کے لوگ آشرم کی ایک جھونپڑی میں چٹائی پر سوتے اور کیلے کے پتل پر کھاتے تھے۔

صرف **مسز نائیڈو** اور **مولانا آزاد** کو چارپائی میسر آتی تھی۔ آشرم میں مقیم **گاندھی جی** کے چیلے کھیتی باڑی اور پارچہ بافی میں وقت گزارتے تھے چنانچہ میں نے **خان عبدالغفار** کو ایک کیاری کی گھاس کاٹتے دیکھا۔

دوسرے دن **گاندھی جی** کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ ایک چھوٹی سی کوٹھری میں آلتی پالتی باندھے چٹائی پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ انھوں نے خندہ پیشانی سے میرے سلام کا جواب دیا اور عینک اتار کر غور سے دیکھا۔ اُن کی شخصیت میں سب سے پُرکشش آنکھیں تھیں، اس لحاظ سے کہ اُن میں اپنے مافیا کو سربستہ رکھنے اور مخاطب کے باطن تک دیکھنے کی طاقت تھی۔ **گاندھی جی** نے کہا:

مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ آپ اردو اور ہندی، دونوں زبانوں کے ادیب ہیں اور سنسکرت سے بھی واقف ہیں۔ یورپ سے لوٹ کر آپ کیا کیجیے گا۔

جواب میں، میں نے کہا:

اگر موقع ملا تو میں ہندو مسلمانوں کی باہمی بدگمانیوں کو دور کرنے کے لیے اپنی صلاحیت کو بروئے کار لاؤں گا۔

گاندھی جی اس جواب سے خوش ہوئے اور کہا:

یہ خیال بہت اچھا ہے۔ قومی اتحاد کا مسئلہ بہت اہم ہے اور یہ صرف سیاست کا میدان نہیں بلکہ علم وادب کی توجہ کا مستحق ہے۔

اس ملاقات کو **گاندھی جی** نے اس طرح یاد رکھا کہ ۱۹۴۵ء میں ہندوستانی لٹریچر بورڈ کا سیکرٹری مجھے نامزد کیا لیکن میں نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا کیوں کہ پانی سر سے گزر چکا تھا۔

عمیق حنفی جدید حسیت کا شاعر

تجمل حسین خاں

عمیق حنفی کا پورا نام **عبدالعزیز حنفی** اور تخلص **عمیق** تھا۔ والد کا نام **محمد عبدالبصیر** اور والدہ **سلیمہ بی** تھیں۔ ۳؍نومبر ۱۹۳۸ء کو بمقام مھو چاؤنی ضلع اندور (مدھیہ پردیس) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں **ہائی اسکول**، ۱۹۵۰ء میں **بی اے**، ۱۹۵۲ء میں **ایم اے** (سیاسیات) ۱۹۵۴ء میں دوبارہ تاریخ میں **ایم اے** کیا۔ دیوداس، اندور مھو اور آشٹہ میں تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔ ۱۹۵۶ء میں بہ طور اسکرپٹ رائٹر آل انڈیا ریڈیو (بھوپال) سے وابستہ ہوگئے۔ ۲؍مئی ۱۹۵۷ء کو ازدواجی زندگی کی شروعات ہوئی۔ ۱۹۶۹ء میں دھلی میں بحیثیت پروگرام ایگزیکٹو ان کا تقرر ہوا۔ ۱۹۷۷ء میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر پھر ڈائرکٹر کے منصب پر فائز ہوئے۔ ۳۰؍نومبر ۱۹۸۷ء کو ملازمت سے اور ۱۳؍اگست ۱۹۸۸ء کو نئی دھلی میں بارِ ہستی سے سبکدوش ہوگئے۔

عمیق حنفی نے اپنے بیش تر ہم عصروں سے کم عمر پائی مگر بہت جلد انھوں نے اپنی ایک الگ

شناخت بنالی تھی۔انھوں نے شاعری بھی کی اور نثر بھی خوب لکھی۔شاعری میں غزل ،رباعی، سانیٹ، گیت سبھی کچھ لکھا۔

منظوم تمثیلیں اور طویل نظمیں بھی کہیں۔سندباد، شب گشت، شہر زاد، سیار گان اور صلصلة الجرس خاصی مشہور ہوئیں۔ نثر میں ان کی چار کتابیں شعلے کی شناخت ،آئینے کا کورس ، استاد رجب علی خاں اور شعر چیزے دیگر است شائع ہوچکی ہیں۔آئینے کا کورس (ڈرامے) اور استاد رجب علی خاں کی سوانح ھندی زبان میں بھی چھپ چکی ہیں۔

عمیق حنفی نے اپنے شعری سفر کا آغاز ھندی مجموعے سانسوں کا سنگیت ' سے کیا تھا۔ان کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔فلسفہ،تاریخ ، فنون، سماجیات، سیاسیات، تہذیب، ثقافت، شعریات اور موسیقی سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ان کی شخصیت بڑی ہمہ جہت تھی۔بظاہر متین،سنجیدہ اور حساس طبع واقع ہوئے تھے۔مگر ان میں شگفتگی اور بذلہ سنجی بھی بہت تھی۔اپنی ہنسی اڑانے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔

عمیق حنفی نے اپنی شاعری میں قدیم اور جدید روایات کو بڑی کامیابی کے ساتھ سمویا ہے۔ ہندوستانی تہذیب وثقافت، ہندوستانی جمالیات، موسیقی اور مصوری سے شغف نے ان کی شاعری کو بھی فائدہ پہنچایا۔عام جدید شعرا کی طرح ان کی شاعری میں زندگی کی بے حصولی، بے معنویت، فنا پذیری اور تنہائی کا کرب نمایاں ہے۔لیکن ان کی فکر کا کینوس بہت وسیع ہے۔ماقبل تاریخ،انسان کی وحشیانہ ترنگوں اور تہذیب کی ابتدا سے لے کر عصرِ حاضر تک کی زندگی کا سارا منظر ان کی نظموں میں سمٹ آیا ہے۔موجودہ دور کی شہری زندگی، مشینی زندگی اور معاشرت کا نقشہ بھی انھوں نے بڑی مہارت کے ساتھ کھینچا ہے۔وہ عصری دور اور تہذیب کو قدیم تہذیب کے دور سے اس طرح منسلک کر دیتے ہیں کہ انھیں علاحدہ کرنا خاصا مشکل ہوجاتا ہے۔وہ زندگی کی اعلا قدروں سے محبت کرتے تھے اور انسان کی ازلی تنہائی کا علاج بھی انہی اعلا اقدار میں تلاش کرتے تھے۔

'صلصلة الجرس 'عمیق حنفی کی ایک انوکھی اور غیر معمولی نظم ہے۔یہ ایک نعتیہ نظم ہے۔جس کا مرکزی حوالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔دوسرے تمام مناظر اسی

قصے کے گرد گھومتے ہیں۔اسی دائرے میں آج کے انسان کی شبیہ بھی ابھرتی ہے جو حواس باختہ، پریشان حال اپنے آپ سے الجھتا اور اپنی اعلا اقدار کو بھولتا جا رہا ہے۔ نیک و بد کی تمیز سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ **عمیق حنفی** اس کی پریشاں سامانی کا سبب اس کی اندرونی صورتِ حال میں دیکھتے ہیں:

ایماں نہ ہو تو مشق حساب تحقیق عالم ہست و بود
مدت کے بعد مدت کے بعد پیشانیوں میں تڑپے سجود
ہوتے گئے تھے ہم تم سے دور اور کتنی دور! تم پر درود
ٹوٹے ہوئے ہیں سارے قیود لب پر تمہارا آ گیا ہے نام
خیر الانام تم پر درود تمّ پر صلوٰۃ تم پر سلام

عمیق حنفی نے طویل نظمیں بھی لکھیں۔ان کی طویل نظموں میں ایک نئی شعریات وضع کی گئی ہے۔طویل نظموں کی روایت **اردو شاعری** میں ہر چند کہ خاصی پرانی ہے اور ہر دور میں ایسی نظمیں لکھی گئی ہیں۔لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد طویل نظم کی روایت ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔طویل نظمیں لکھنے والوں نے آپ بیتی، کہانی، داستان، سفر نامے، ڈرامے اور شہر آشوب کی گنجایش بھی طویل نظم میں پیدا کر لی۔**عمیق حنفی** کی نظموں میں تجربہ اور اظہار دونوں نئے ہیں۔موجودہ دور کا تہذیبی، معاشرتی، سماجی اور سیاسی ماحول ان کے یہاں نمایاں ہے۔ان میں ایک نئی فلسفیانہ فکر بھی ملتی ہے۔**عمیق حنفی** کی شاہکار نظم 'سند باد' کے بارے میں **شمیم حنفی** کا کہنا ہے:

عمیق حنفی کی نظم 'سند باد' نے ہندوستان
میں سن ساٹھ کے بعد کی نظم کو ایک نظریاتی
اساس بہم پہنچائی ہے۔ تخلیقی تموج، اپنی
جرأتِ اظہار اپنی حسیّت کی تمازت اور شدت
کے لحاظ سے عمیق حنفی کو اپنے عہد میں ایک
خاص امتیاز حاصل ہوا۔ ان کے شعری ادراک
کی وسعت کا اندازہ اس کے مقامی سیاق کے
ساتھ ایک عالمگیر معاشرتی اور تہذیبی سیاق

سے ہوتا ہے۔

(قاری سے مکالمہ ——شمیم حنفی،ص:۱۸۵)

عمیق حنفی خود اپنی طویل نظم 'شہرزاد' کے بارے میں لکھتے ہیں:

...شہرزاد آج کے شہری کرب اور شہری زندگی میں قدروں کے بحران کا المیاتی احساس پیش کرنے کا شعری تجربہ ہیں۔ آج کی شہری زندگی کے تصنع، اس کی بوریت، اس کے یکسرے پن، بے حسی، فرصت نما بے کاری، تنہائی اور اجنبیت، گھٹن، بے ہنگم، بدھیئت اور بے مقصد پھیلاؤ اور جغرافیائی قربت کے باوصف بڑھتی ہوئی دلی اور روحانی دوری کو اپنے ان تجربوں میں الفاظ وآواز کے قالب میں ڈھالنے پر میں مجبور ہوں۔

(شعلے کی شناخت ——عمیق حنفی،ص:۱۵۷تا۱۵۸)

عمیق حنفی کی ایک اور خوبی ہے وہ یہ کہ وہ نامانوس تجربوں، نامانوس لفظوں کے استعمال سے نہیں ڈرتے۔ ان کا تخیل بلند، مشاہدہ آزاد اور وسیع ہے۔ ان کی تخلیقات کا سب سے نمایاں دور ۶۵-۱۹۶۴ء تا ۷۶-۱۹۷۵ء تک کا رہا۔ اس دور میں انھوں نے بہت عمدہ قسم کی نظمیں لکھیں۔ مثلاً 'تجدید' 'ایک خواہش'، 'موت میری جان موت'، 'شعر سنتا ہے'، 'ابال'، 'مالی سال ۷۴-۷۳ کا سورج اور سیارگان' اس دور کی سب سے کامیاب نظمیں ہیں۔ کچھ نظموں کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

روشنائی خشک نِب ٹوٹی ہوئی کاغذ کی آنکھیں نم
دیمکوں کا گھر دماغ
اور میری تاک میں تو

کیوں رگ وپے میں سرایت کررھا ھے یہ سیاہ احساس

لمحہ لمحہ ختم ھوتا جارھوں

آنکھ سے ٹپکے ھوئے اشکوں کے ساتھ

قطرہ قطرہ ختم!

نقطہ نقطہ ختم!

کچھ تبسم قرض لے کر

سود میں اپنے بدن کا گوشت ادا کرنے کے ھر وعدے کے ساتھ!

ختم ھوتے جارھے ، مجھ کو اگر پا بھی گئی تو کیا کرے گا

موت میری جان موت

(موت میری جان موت،نظم)

آج کل سورج بھت مصروف ھے

صبح کاذب سے بھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ قبل

تیل، ایندھن، دودھ کی حاجتوں کی بے سرا لمبی قطاروں سے گزرنا

بس کے اڈوں پر کئی گھنٹے برابر رینگتے رھنے کے بعد

پائدانوں پر کھڑے رھنا

کھڑکیوں سے

اور پچھواڑے لٹکنا

دیر سے دفتر پھنچنا

ڈانٹ کھانا تلملانا

چائے بیڑی غصہ پینا

گالیاں بکنا جھگڑنا

فقرے کسنا

نعرے لگانا

شام تک جھک مار کر تھک مار کر
پھر کسی بس سے لٹک جانا
چائے خانوں۔تھیٹروں میں کلبلاتی بھیڑ پر
حسرت بھری بھوکی نگاھیں ڈالنا
پیٹ میں دوچار لقمے ڈال کر چپ چاپ سوجانا
اور پھر
صبح کاذب سے بھی گھنٹہ قبل
آج کل سورج بہت مصروف ھے

(مالی سال ۷۴،۷۳کا سورج،از:عمیق حنفی،ص:۶۸ تا۶۹)

یہ ھانڈی ابلنے لگی
یہ مٹی کی ھانڈی ابلنے لگی ھے
یہ مٹی کی دیوانی ھانڈی ابلنے لگی ھے
ابلنے لگیں سبزیاں پھول، پھل گوشت، دالیں اناج
ابھی شوربے کے کھدکنے کی آواز چھائی ھوئی تھی
ابھی سانپ چھتری لگاتے ھوئے بھاپ نیلے خلاؤں کی جانب رواں ھے
وہ جس کی ضیافت کی تیاریاں تھیں کھاں ھے
مری آتما جاگ کر چیختی ھے
یہ ھانڈی ابلنے لگی ھے
یہ مٹی کی دیوانی ھانڈی ابلنے لگی ھے

(شجر صدا،از:عمیق حنفی،ص۶۶)

عمیق حنفی نے رباعیات بھی لکھیں جس میں انھوں نے اپنے جذبات واحساسات کو مؤثر انداز میں پیش کیا ہے مثلاً:

اللہ بچاؤ مجھے تنہائی سے

تن من کو جھلستی ھوئی پروائی سے
پونم کے چاند سے برستے ھیں شرر
چیخوں کی صدا آتی ھے شھنائی سے
(سنگِ پیراھن، از: **عمیق حنفی**، ص:۳۲)

دل آج بھت بگڑرھا ھے ساقی
ھر رات تجھ سے لڑرھاھے ساقی
ایسا تو نہ تھا پھلے مگر کیا کیجیے
حالات کا عکس پڑ رھا ھے ساقی
(سنگِ پیراھن، از: **عمیق حنفی**، ص:۲۳)

دل ملے تو دوا تلاش کریں
دردِ دل آشنا تلاش کریں
راحتوں سے تو غم ھی غم پائے
رنج راحت فزا تلاش کریں
رات کے بعد رات ھی آئی
رات کے بعد کیا تلاش کریں
(شجر صدا، از: **عمیق حنفی**، ص:۱۲۳)

عمیق حنفی کی شاعری میں عصری حسیت کے تمام رنگ موجود ہیں۔ علامتوں اور استعاروں کی مدد سے اپنے خیالات کی صورت گری کرتے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب، معاشرت، سماجی زندگی، سیاسی زندگی کی عکاسی، ان کی نظموں میں خاصے موثر انداز میں کی گئی ہے۔

عمیق حنفی نے نظموں کے علاوہ غزلیں بھی لکھیں ان کی غزلوں کا ذائقہ بھی سب سے الگ ہے۔ بے تکلف، تخلیقی جسارت سے مالا مال اور قدرے کھردے کچھ شعر دیکھیے:

سگریٹ جسے سلگتا ہوا، کوئی چھوڑ دے
اس کا دھواں ہوں اور پریشاں دھواں ہوں میں

پھول کھلے ہیں لِکھا ہوا ہے توڑو مت
اور مچل کر جی کہتا ہے چھوڑو مت

عمیق حنفی نے نثر میں بھی بہت وقیع کام کیا ہے۔شعلے کی شناخت ، آئینے کا کورس ،استاد رجب علی خاں اور شعر چیز دیگر است ،یہ چاروں کتابیں اپنے موضوع وسعت اوران کی رنگارنگی کے اعتبار سے خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔

شعلے کی شناخت ،**عمیق حنفی** کے مضامین کا مجموعہ ہے۔اس کتاب میں کل گیارہ مضامین ہیں جیسے تجھے میر سمجھا ھے کم یاں کسی نے، میر صاحب اور نئی غزل، غالب کی حسیت کے چند عناصر، اقبال اور مسجد قرطبہ ، شعلے کی شناخت (۱)شعلے شناخت (۲)ٹوٹی سوئی والا قطب نما،جدید شہر اور جدید شعر ، اردو نظم میں عصری آگھی اورھم عصر تخلیق، آزادی کے معنی وغیرہ۔

شعلے کی شناخت کے عنوان سے انھوں نے جو دو مضامین قلم بند کیے ہیں ان میں خاصے فکر انگیز مباحث اٹھائے گئے ہیں۔

عمیق حنفی ایک انتہائی مضطرب تخلیقی ذہانت کے مالک تھے۔اس کے علاوہ آزادی کے بعد **اردو ادب** کو ایک نئی ہلچل سے دوچار کرنے والے اہم ترین افراد میں شامل ہیں۔ھندوستان میں جدیدت کی جانب آغاز کرنے والوں میں انھیں اولیت حاصل رہی۔لیکن جدیدیت کا سلسلہ جب آگے بڑھا اور اس پر زندگی کے وسیع تر سروکار سے مغائرت اور خالص ہیئت پرستی کے رجحانات **غالب** آنے لگے تو **عمیق حنفی** نے شاعری کے ایک ایسے تصور پر زور دینا شروع کیا جس سے آنے والی منزلوں کا پتا چلے۔

عمیق حنفی اس راہ پر آگے بڑھتے اور ہمارے درمیان موجود ہوتے تو شعر وادب کی نئی بحثوں میں ضرور موثر مداخلت کرتے۔مگر اس سے پہلے ہی وہ اپنے ابدی سفر پر روانہ ہوگئے۔لیکن ادب اور زندگی کے معاملات پر اپنی گہری سوچ کا جو سرمایہ انھوں نے چھوڑا ہے اس میں احساس وخیال کی ایسی ضیا موجود ہے جو نئے ادبی مکالمے کی راہ نمائی کرسکتی ہے۔**عمیق حنفی** کی شعر وادب میں یہ خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

R.N.I. No. DEL/14431/60/85 | Vol. No. 119, | No. |

The Monthly Jamia
ISSN 2278-2095
Zakir Husain Institute of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia, Jamia Nagar, New Delhi-110025
Phone: 011-26841202